ٹارزن کا بیٹا

# ٹارزن کا بیٹا

چوتھا حصّہ

ایڈگر رائس بروز

مظہر انصاری دہلوی

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

| | |
|---|---|
| بار ششم | ۱۹۷۳ |
| تعداد | ۲۰۰۰ |
| قیمت | ۴-۷۵ روپے |

# وہ آ گیا

ایک امریکی جہاز افریقہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ وہ سائنس کی کچھ باتیں معلوم کرنے نکلا تھا۔ ایک جگہ وہ رُک گیا۔ اُس کے کُچھ آدمیوں کو کوئی بات معلوم کرنے کے لیے ساحل پر اُتارا جانے لگا مگر ابھی وہ کشتی میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک ایسا نظارہ دیکھا جس سے حیران رہ گئے۔

ساحل پر جو جنگل تھا اس میں سے ایک آدمی نکلا۔ آدمی کیا تھا ہڈّیوں کی مالا

تھا۔ جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور چہرے پر سفید ڈاڑھی تھی، جو سینے تک پہنچی ہوئی تھی۔

کشتی کے آدمی چپّوؤں پر کہنیاں ٹِکا کر بیٹھ گئے اور اُسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

ایک جہازی نے کہا۔ ”یہ آدمی تو سفید ہے۔ یورپی لگتا ہے۔“

دوسرے جہازی نے اس سے پوچھا۔ ”انگریزی بول سکتے ہو؟“

وہ آدمی انگریزی بول سکتا تھا۔ اُس نے اُن سے درخواست کی کہ اُسے وہاں سے لے چلیں۔ کشتی والے ساحل پر اُتر پڑے۔ انہوں نے اُسے دانہ پانی دیا۔ وہ بہت بھوکا معلوم ہوتا تھا۔ سب کچھ جلدی جلدی پیٹ میں اُتار لیا۔ پھر اُس نے بتایا کہ میرا نام سبروف ہے۔ دس پندرہ برس پہلے ایک افریقی قبیلے نے مُجھے پکڑ کر قیدی بنالیا تھا اور اتنی بُری طرح رکھا تھا کہ میرا زندہ رہنا بھی ایک کرامت تھی۔ کشتی والے اُسے جہاز پر لے آئے۔ نہلایا، کپڑے پہنائے اور علاج کروایا کیوں کہ اُس کی حالت دیکھ کر سب کو

اُس پر ترس آ گیا تھا۔ ایک دِن جہاز ایک جزیرے پر رُکا اور جہاز والے وہاں پر اُتر گئے۔ سبروف کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے اور اُسے اپنے ساتھ ہی رکھا۔ پھر ایک دِن ایسا ہوا کہ ایک جگہ ایک چیتا نظر آیا تو کسی جہازی نے اُسے گولی مار دی۔ سب لوگ اُسے دیکھنے کے لیے گئے مگر سبروف نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

وہ ایک درخت کے نیچے لیٹ کر اونگھ گیا تھا۔ کسی نے اُس کے کندھے کو چھوا۔ وہ فوراً جاگ گیا۔ اُس کے پاس ایک بڑا سارا جھبرا گوریلا اُکڑوں بیٹھا تھا۔ سبروف فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا مگر اتنا ڈر گیا کہ ہل جُل نہ سکا۔ گوریلے نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور کچھ بڑبڑایا مگر اس نے سبروف پر حملہ نہ کیا۔

سبروف اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پرے ہٹنے لگا مگر گوریلا اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ اب بھی اپنی بولی میں بڑبڑا رہا تھا۔

جب جہازیوں نے اُن دونوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پہلے تو اِدھر اُدھر

بھاگنے لگے۔

پھر جب دیکھا کہ گوریلا اُن پر حملہ نہیں کر رہا تو قریب آ گئے۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ گوریلے نے ایک جہازی کے پاس پہنچ کر اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ہر بار اس طرح سر ہلایا جیسے مایوسی ہوئی ہے۔

جہازی یہ سمجھے کہ گوریلے کو کِسی انسان نے سدھا لیا تھا۔ مگر اُن میں سے ایک احمق نے چاقو لے کر اُس کی نوک گوریلے کی پیٹھ میں چبھو دی۔

گوریلا بجلی کی طرح مُڑا۔ چاقو جہازی کے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دیا اور اپنے لمبے دانت اس کے کندھوں میں گاڑ دیے۔ جہازی اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے دوڑے۔ گوریلے نے غصّے سے دھاڑتے ہوئے اپنے طاقت ور ہاتھوں سے سب جہازیوں کو گِرا دیا۔ اس پر کپتان پستول لیے ہوئے پہنچ گیا۔ مگر جنگلی آدمی اُس کے اور گوریلے کے درمیان آ گیا اور چلّایا۔ ”ٹھہرو، یہ گوریلا میرا ہے۔“ کپتان فائر کرتے کرتے رُک

گیا۔ اس وقت جہازیوں نے اپنے آدمیوں کو گوریلے سے چھڑا لیا تھا اور گوریلا ان کے درمیان کھڑا بڑے خونخوار انداز سے غرّا رہا تھا۔ سبروف گوریلے کے پاس جا کھڑا ہوا اور چلّا کر بولا۔ "یہ میرا ہے۔ اگر اس احمق جہازی نے اِس کے پیٹھ میں چاقو نا چبھویا ہوتا تو یہ کسی کو کچھ نہ کہتا۔"

گوریلا اس وقت چپ چاپ کھڑا تھا اور اس نے سبروف کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ آگے بڑھ کر کپتان اور اس کے نائب کے پاس پہنچ کر ان کے چہروں کو غور سے دیکھا اور اس طرح سر ہلایا جیسے مایوسی ہوئی۔ پھر واپس آکر سبروف کے پاس اس طرح چُپ چاپ کھڑا ہو گیا جیسے اور آدمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

وہ سب جہاز پر سوار ہوئے تو گوریلا بھی اُن کے ساتھ آیا۔ جہازیوں نے اُس کے لیے اسی چھوٹے سے کیبن میں کچھ پرانے کمبل ڈال دیے جو سبروف کو رہنے کے لیے دے رکھا تھا۔

رات کو جہازیوں میں سبروف اور گوریلے کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ نائب کپتان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سبروف نے اس گوریلے کو اب سے پہلے دیکھا تک نہیں تھا۔“

کپتان اس سے پوچھنے لگا۔ ”تُم نے یہ اندازہ کس طرح کیا؟“

نائب کپتان بولا۔ ”سبروف نے گوریلے کو نام لے کر نہیں پکارا۔ اگر یہ گوریلا اس کا پالتو ہوتا تو وہ اس کا نام لے کر پکارتا۔ ہے نا ٹھیک؟“

مگر سبروف اس رات گوریلے کو اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ اُس نے گوریلے کو اجیکس کہہ کر بلایا مگر گوریلا اِس نام پر آیا نہیں کیونکہ یہ اُس کے لیے نیا تھا۔ اُسے بہت دِن بعد معلوم ہوا کہ سبروف نے اس کا یہ نام رکھا ہے۔

ایک مہینے بعد جب جہاز انگلستان پہنچا تو سبروف نے کہا کہ وہ یہاں اُترنا چاہتا ہے۔ اِس وقت اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جیسے یہ خیال کر کے اُن میں غیر معمولی روشنی آگئی ہو کہ انگلستان میں اُسے کیا کام

کرنا ہے۔ کپتان نے اپنے دل میں سوچا، یہ شخص جنگل میں سختیاں جھیلتے رہنے کی وجہ سے پاگل ہو گیا ہے۔ اُس نے سبروف سے پوچھا۔ ”اجیکس کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے ؟“

سبروف نے تن کر کہا۔ ”اجیکس میرا ہے۔“

کپتان جلدی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لے جاؤ اِسے بھی۔ مگر اِس کا کرو گے کیا؟“

سبروف بھی یہی سوچتا رہا تھا اور اُس نے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔ کہنے لگا۔ ”میں اِسے سرکس میں رکھوا دوں گا۔ میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ یہ مُجھے کما کر کھلائے گا اور۔۔۔۔“

اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کپتان نے تعجّب سے پوچھا۔ ”اور کیا؟“

سبروف نے پہلے تو کوئی دیر تک جواب نہ دیا۔ پھر جلدی سے بولا ”اور یہ کہ ہم دونوں مل کر ایک آدمی کو تلاش کریں گے جس سے میں اتنی نفرت

کرتا ہوں کہ اور کسی سے نہیں کرتا۔ اور جب میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا تو اُسے ترساترسا کر، اِسی طرح ایذائیں دے دے کر ماروں گا جس طرح میں برسوں تکلیفیں اٹھاتا رہا ہوں۔ اُسی آدمی نے مجھے افریقہ کے کالے شیطانوں کے چنگل میں پھنسایا تھا۔"

کپتان نے اپنے دل میں کہا۔ "پاگل ہے۔ اس قسم کے انسان پاگل ہی ہوا کرتے ہیں۔"

سبروف حقیقت میں پاگل ہی تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر اُس آدمی سے اُس کی کبھی مُڈ بھیڑ ہو گئی جس سے وہ اتنی نفرت کرتا ہے تو اُس کی مشکل آ جائے گی۔

وہ شخص گوریلوں کا بادشاہ ٹارزن تھا۔ جس سے سبروف کو نفرت تھی اور یہ سبروف اصل میں پال وِچ تھا جسے ٹارزن نے حبشیوں کے چُنگل میں پھنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

# ٹارزن کا پُوت

ٹارزن نے لندن پہنچنے کے بعد اپنے باپ کی جائیداد حاصل کرلی تھی اور اسے نوّاب کا خطاب بھی مل گیا۔ لیکن اُسے اس بات کی بڑی فکر تھی کہ کہیں اس کے بیٹے جیک کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس کا باپ گوریلوں میں پلا ہے، اس نے گوریلی کا دودھ پیا ہے اور افریقہ میں گوریلوں کا سردار رہ چکا ہے۔ اُسے اندیشہ تھا کہ یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد وہ بھی یہی چاہے گا کہ میں افریقہ پہنچوں اور اپنے باپ جیسی زندگی بسر کروں۔ ٹارزن کو اپنے بچّے سے بڑی محبّت تھی اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ

افریقہ کے جنگلوں میں حیوانوں جیسی زندگی گزارے۔ اُس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے اُسے افریقہ نہ جانے دے گا۔ ٹارزن کا دل کہتا تھا کہ اگر جیک کو یہ سُن گُن مل گئی کہ اس کا باپ افریقہ میں حیوانوں جیسی زندگی بسر کر چکا ہے تو اسے افریقہ کی کشش بے قابو کر دے گی۔ اِسی لئے ٹارزن کی بیوی نے جیک کو اس طرح پالا پوسا کہ وہ اس بات سے بالکل بے خبر رہا کہ اس کا باپ گوریلوں کا ٹارزن ہے، جس کے بارے میں کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ وہ یوں ہی سمجھتا رہا کہ اس کا باپ انگلستان کے ایک نوّاب خاندان سے ہے۔ پارلیمنٹ کا ممبر ہے اور ایک خاندانی آدمی ہے۔ مگر جیک میں حیوانوں پر قابو پا لینے کی عجیب خُو موجود تھی۔ یہ اُسے ٹارزن سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ کتّے جو اوروں پر بھونکتے اور غرّاتے تھے، اُس کی آواز پر دُم ہلانے لگتے تھے۔ وہ سرکش گھوڑے جو کسی اور کو اپنے پُٹّھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے اس کے آگے گردن ڈال دیتے تھے۔ ٹارزن اور اس کی بیوی نے جب یہ دیکھا تو فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے چڑیا گھر نہیں جانے دینا ہے۔ خاص کر افریقہ کے حیوان ہرگز نہیں دیکھنے دینے ہیں۔

کیوں کہ انہیں دیکھ کر اُس کے دل میں افریقہ جانے اور ایسے حیوانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا شوق مچلنے لگے گا۔ مگر ایک دِن اِسی بات پر ٹارزن کے محل میں اچھی خاصی بغاوت ہو گئی۔ محل کے قریب ایک سرکس آیا تھا۔ اسی میں ایک گوریلا تھا، جس کا نام اجیکس تھا۔ ایک دنیا اُسے اور اُس کے کرتب دیکھنے کے لیے ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ جیک اُس گوریلا کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھا اور ماں باپ سے سرکس دیکھنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ مگر وہ اجازت نہیں دے رہے تھے۔ انہیں اِس کا افسوس تھا کہ وہ اپنے بچّے کو سرکس دیکھنے سے منع کر رہے ہیں، مگر اِس کے سوا چارہ نہ تھا۔

ٹارزن آنکھوں میں محبّت کی چمک لیے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا، جو اُس کے سامنے تنا کھڑا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر جین کھڑی تھی۔ اُس کی نظریں اپنے تندرست اور طاقتور بیٹے پر تھیں اور ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُن کے عین پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اُس کا نام مُور تھا۔ اس وقت اُس کا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا

کیونکہ وہ اِس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نوّاب ٹارزن کے بیٹے کا استاد بننا لوہے کے چنے چبانا ہے اور اس کام کی تنخواہ بڑے کسالے کی کمائی ہے۔

جیک کہہ رہا تھا۔ "ابّا ایک دنیا اس گوریلے کو دیکھنے سرکس کی طرف بھاگی چلی جارہی ہے۔ ایک لڑکا کہہ رہا تھا کہ بڑا عجیب جانور ہے جو اسے دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ وہ سائیکل چلاتا ہے اور دس تک گنتی بھی گِن لیتا ہے اور ان کاموں کے علاوہ اور بھی کتنے ہی ایسے کرتب دکھاتا ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔" ٹارزن بیٹے کی باتیں غور سے سُنتا رہا پھر بولا۔ "مگر بیٹا، میں نہیں چاہتا کہ تم سرکس دیکھو۔"

جیک بغاوت پر اُتر آیا۔ اس نے غصّے سے چہرہ اوپر اُٹھایا اور کہا۔ "مگر میں تو دیکھوں گا۔"

ٹارزن بولا۔ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تُم سرکس دیکھنے نہیں جاؤ گے۔"

جیک نے تن کر کہا۔ "میں جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔"

”میں تمھیں سزا دوں گا۔“

”میں سزا برداشت کرلوں گا۔“ یہ کہہ کر جیک اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

باپ اور ماں، دونوں کے دل فخر اور خوشی سے اُچھل رہے تھے۔ مگر انہیں کُچھ کُچھ پریشانی بھی تھی۔

اس کے چلے جانے کے بعد ٹارزن نے مسٹر مُور سے کہا۔ ”اس پر نظر رکھو۔ اِسے کمرے سے باہر نہ نکلنے دو تاکہ سرکس نہ جاسکے۔“

بے چارا مُور کیا جواب دیتا۔ آنکھیں جھپکاتا ہوا اُوپر کی منزل میں چڑھ گیا۔ جیک کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ پل بھر کے لیے جھجکا۔ پھر آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر جھانکا۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جیک سرکس جانے کی تیّاریاں کر رہا تھا۔

وہ کھڑکی کی لگر پر بیٹھا تھا اور پائپ کے سہارے نیچے اُترنے کو تھا۔ اُستاد کو

دیکھتے ہی بولا۔ ”خبردار، میرے قریب نہ آنا۔“

مگر مور کو ٹارزن کے بیٹے سے زیادہ ٹارزن سے ڈر لگتا تھا۔ اُس نے جیک کے قریب پہنچ کر اُسے پکڑ لیا اور کہا۔ ”تمہارے ابّا کا حکم ہے کہ تم سرکس دیکھنے نہیں جاؤ گے۔ نیچے اتر آؤ۔“

”اچھا۔“ جیک نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا اور کھڑکی سے نیچے اُتر آیا۔ ”اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو یہی سہی۔“

یہ کہہ کر اُس نے مسٹر مُور کو پکڑ کر اُوپر اُٹھالیا اور اِتنی آسانی سے اُٹھایا کہ مسٹر مُور کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

مُور بہت بھاری بھرکم آدمی تو نہیں تھا مگر اتنا ٹھِنگنا اور ہلکا پھلکا بھی نہ تھا کہ جیک سا لڑکا اُسے اٹھا لے۔

چند لمحے بعد جیک نے اُسے بستر پر اوندھا لِٹا کر اُس کے مُنہ پر ایک کپڑا رکھ کر باندھ دیا۔ پھر اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور کھڑکی سے نیچے اُتر کر

سرکس دیکھنے چلا گیا۔

مسٹر مُور کا غصّے کے مارے بُرا حال تھا۔

ایک بچّے نے اُسے بے بس کر دیا تھا۔ یہ اُس کی توہین تھی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ جیک ہونے کو تو بچّہ ہی ہے مگر اِس چھوٹی عمر میں بھی بڑوں سے زیادہ کَس بَل رکھتا ہے۔

مگر اپنی توہین سے زیادہ مسٹر مُور کو یہ دُبدا ہو رہی تھی کہ نوّاب کیا کہے گا۔ اُس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ اور اُس نے قسم کھالی کہ ہاتھ پاؤں کھلتے ہی یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائے گا۔

خوف اور غصّے سے مسٹر مُور نے کچھ اِس طرح بل کھائے کہ وہ بستر سے گِر پڑا۔ اب مسٹر مُور کو ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے اپنی لاتیں اُٹھا کر زور سے فرش پر مارنی شروع کر دیں۔

نیچے کے کمرے میں ٹارزن نے یہ دھماکے سُنے تو بیوی سے کہا۔ "جیک یہ کیا

کر رہا ہے؟" بیوی نے بھی سر ہلا کر حیرانی ظاہر کی۔ ٹارزن نے گھنٹی بجا کر خادم کو بلایا اور کہا۔ "ماسٹر جیک کے کمرے میں جاؤ اور یہ معلوم کر کے آؤ کہ یہ دھماچوکڑی کیوں مچی ہوئی ہے؟"

پانچ منٹ بعد خادم گھبرایا ہوا واپس آیا۔

اس کے پیچھے پیچھے جیک کا اُستاد تھا جس کا حُلیہ بگڑا ہوا تھا۔

اس نے جلدی سے کہا۔ "وہ چلا گیا۔"

"کہاں چلا گیا؟" ٹارزن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سر کس دیکھنے۔" مسٹر مُور نے جواب میں کہا۔ "اُس بدبخت اجیکس کو دیکھنے کے لیے اور میں بھی جا رہا ہوں۔ استعفیٰ دیتا ہوں۔ آپ کے صاحبزادے کو اُستاد کی نہیں حیوان سُدھانے والے آدمی کی ضرورت ہے۔"

ٹارزن کو ہنسی آنے لگی مگر اُس نے روک لی۔

مُور جھپٹ کر باہر نکل گیا۔

ٹارزن نے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میرا خیال ہے، مُجھے بھی سر کس پہنچنا چاہیے۔“ اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ کسی ہنگامے کا آغاز ہے۔

# گوریلا

جیک سرکس کے اندر داخل ہوا تو وہاں کی جگمگاتی روشنیوں، باجوں کی آوازوں اور رونق سے اُس کا دل لہرا اُٹھا۔ اور جب جانوروں کے کرتب دکھانے کی باری آئی تو وہ تن کر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔

پہلے شیر آئے۔ انہیں دیکھ کر جیک کو اپنے دل میں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جانی پہچانی مخلوق سامنے ہے۔ اُسے ان میں ایسی کشش محسوس ہوئی جیسے وہ اسے اپنی طرف کھینچے لیے جا رہے ہیں۔

پھر ہاتھی آئے۔ ایک بار پھر اُس کا دِل اُن کی طرف کھنچنے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُسے صرف افریقی حیوانوں میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ ویسے دریائی بچھڑے کے کرتب اور ریچھ کا ناچ بھی اچھّا لگا مگر افریقی جانوروں کو دیکھ کر تو اس کا دل بَلّیوں اچھلنے لگتا تھا۔

پھر سب سے آخر میں گوریلا "ابجیکس" آیا۔ جسے دیکھنے کا سب کو اشتیاق تھا۔ ایک دیو جیسا انسان معلوم ہوتا تھا۔ جیک کو اُس کے سامنے آتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے کوئی چیز آکر لگی۔۔۔۔وہ تن کر بیٹھ گیا اور اس کی نظریں ابجیکس پر اِس طرح جم کر رہ گئیں کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیا۔

اب ابجیکس نے کام دکھانا شروع کیا۔ وہ تو واقعی کمال کر رہا تھا۔ دس تک گنتی گنی۔ جو چیزیں اُس کے آگے رکھی گئیں، انہیں پہچان لیا۔ جس چیز کا نام لیا جاتا وہ فوراً اُٹھا کر دے دیتا۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ پھر ابجیکس کو تماشائیوں کے درمیان لا کر اُس سے کہا گیا۔ "ابجیکس، نیلے لباس والی خاتون کون سی ہیں؟" ابجیکس نے اُس خاتون کو

ڈھونڈ نکالا۔ کہا گیا۔ ”بھورے سوٹ والے صاحب کو ڈھونڈ کر بتاؤ۔“
اجیکس نے اُن صاحب کو بھی ڈھونڈ لیا۔

جیک نے بھاری بھر کم گوریلے کو اپنی کرسی کے قریب آتے دیکھا۔ اسے
اجیکس کے قریب ہونے سے اتنی زبردست سنسنی محسوس ہوئی کہ اس کا
دم گھٹنے سا لگا۔

اجیکس سے کہا گیا۔ ”سفید کوٹ والی خاتون کو تلاش کرو۔“ مگر اجیکس اس
وقت کام نہیں دکھا رہا تھا۔ وہ جیک کے سامنے رُک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک
لمحے تک وہاں کھڑا جیک کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اتنا زیادہ جوش میں آ
گیا کہ آس پاس کی کرسیوں کے مرد عورت گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔
مگر جیک اپنی کرسی پر جما رہا۔ دیو جیسا گوریلا اُس پر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں
جگر جگر کرنے لگی تھیں مگر جیک کو اس سے بالکل ڈر نہ لگا۔

اجیکس نے اپنے طاقتور پنجے جیک کے کندھوں پر رکھ دیے اور اُس کے
چہرے کو نظر جما کر دیکھنے لگا۔ وہ جوش میں آ کر تیزی سے بول رہا تھا مگر

جیک کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گوریلا اُلجھن میں پڑا ہوا ہے اور کوئی بات ایسی ہے جس کے بارے میں ٹھیک طرح رائے قائم نہیں کر سکا ہے۔ گوریلے کو سدھانے والا اُسے آوازیں دینے لگا کہ واپس آ جاؤ، مگر اجیکس ایسا بنا ہوا تھا جیسے یہ آوازیں سُن ہی نہیں رہا۔ وہ جیک سے باتیں کر رہا تھا اور اُس کو گلے سے لگا کر چمکار رہا تھا۔ آس پاس بھگدڑ مچی ہوئی تھی مگر جیک کو اُس بھگدڑ کی کُچھ خبر نہیں تھی۔ جیک کے پاس کی کرسی خالی ہوئی تو اجیکس فوراً اُس میں بیٹھ گیا۔ اپنا ایک بازو جیک کی گردن میں ڈال لیا اور اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ گوریلے کو سدھانے والا کوڑا چٹخا چٹخا کر اُسے واپس بُلا رہا تھا مگر گوریلے نے ایک کان گونگا ایک بہرہ کر لیا۔ تماشائیوں میں سے کُچھ لوگ اِس مزے دار تماشے سے خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔

اجیکس کی اس حرکت سے تماشا رُک گیا تھا۔ سرکس کے منیجر نے گوریلے کو سُدھانے والے سے تکرار شروع کر دی۔ وہ دوڑ کر اجیکس کے پاس آیا

اور چیخ چیخ کر اُسے واپس بلانے لگا مگر اجیکس اسی طرح بیٹھا اپنی زبان میں جیک سے باتیں کرتا رہا۔

تماشائیوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ سدھانے والا اور زیادہ غصّے ہوا۔ اس نے گوریلے پر چابُک اُٹھایا مگر جیک پھُرتی سے اُٹھا اور سدھانے والے کو اُٹھا کر نیچے پٹک دیا۔

اس پر منیجر غصّے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے اپنے پہلوان بُلا لیے۔ اجیکس غرّاتا ہوا جیک کے برابر آن کھڑا ہوا۔ اب اُدھر بہت سے پہلوان تھے اور اِدھر یہ دونوں۔ لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور غصّے سے سرکس والوں پر چیخنے لگے۔

یکایک ایک لمبا تڑنگا دیو قد آدمی آگے بڑھ کر پہلوانوں، گوریلے اور جیک کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا۔ تماشائی کھڑے تو رہے مگر فوراً خاموش ہو گئے اور اِس منظر کو بڑی توجّہ سے دیکھنے لگے۔

جیک اُس آدمی کو دیکھتے ہی حیرت سے چیخ اٹھا۔ "ابّا۔" اجیکس نے اُسے

دیکھا تو خوشی سے دیوانہ سا ہو گیا۔

اب گوریلا ٹارزن کو آغوش میں لے کر آہستہ آہستہ دبا رہا تھا اور اپنے بڑے بڑے پنجے بھی اُس کے کندھوں پر پھیر رہا تھا۔ تماشائی گوریلے کی باتوں کا مطلب تو نہیں سمجھ رہے تھے مگر اُنہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ٹارزن سے مل کر بے حد خوش ہوا ہے۔ پھر ایک ایسی بات ہوئی جس سے سب حیران رہ گئے۔ ٹارزن کے مُنہ سے بھی گوریلے جیسی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ گوریلے سے اُسی کی زبان میں باتیں کر رہا تھا۔

تماشائی بہت خوش ہو رہے تھے اور اُن دونوں کو ٹِکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ مگر ایک طرف سے ایک کُبڑا آدمی بھی، جس کے بھیانک چہرے پر چیچک کے داغ تھے، اُن دونوں کو ایسی آنکھوں سے گھور رہا تھا جِن میں نفرت تھی۔ اُدھر ٹارزن اور اس کے دوست آکُوٹ میں باتیں ہونے لگیں (جس گوریلے کا نام پال وِچ نے اجیکس رکھا تھا، وہ آکُوٹ تھا)

آکُوٹ نے کہا۔ ’’ٹارزن، میں تمہیں ڈھونڈ تا پھِر ا ہوں۔‘‘

ٹارزن بولا۔ ”آکُوٹ، تُم بھی مجُھے بہت یاد آئے ہو۔“

آکُوٹ کہنے لگا۔ ”میں تُم سے ملنے کو بے چین تھا۔ تُم مل گئے تو میرے دل کو قرار آگیا۔ اگر تم چاہو تو میں یہیں رہنے لگوں۔“

ٹارزن بولا۔ ”میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم عمر بھر میرے پاس رہو مگر تم یہاں کی سردی برداشت نہ کر سکو گے۔ تمہاری جگہ افریقہ ہی میں ہے۔ تم وہیں اچھے رہو گے۔“

آکُوٹ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں نے تم سے مل لیا۔ دل خوش ہو گیا۔ اب میں اپنے جنگل میں واپس چلا جاؤں گا۔“

سرکس کے مینیجر نے پولیس کو بلا لیا تھا۔ ٹارزن نے آکُوٹ سے کہا کہ اِس وقت وہ چُپ چاپ سُدھانے والے کے ساتھ واپس چلا جائے۔ کل وہ اُس کے افریقہ پہنچائے جانے کا انتظام کر دے گا۔ آکُوٹ نے ٹارزن کو گلے لگایا اور سُدھانے والے کے ساتھ ہو لیا۔ تماشائیوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ٹارزن نے اپنے گھر واپس پہنچنے کے بعد اپنی ساری داستان جیک کو

سُنا دی۔ جب یہ داستان ختم ہوئی تو جیک اچانک بول اٹھا۔ ’’میں بھی افریقہ جا کر آپ جیسا گوریلا بنوں گا۔‘‘ ٹارزن اور اُس کی بیوی کو اِسی کا دھڑکا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

اگلے دِن ٹارزن، آ کُوٹ سے ملنے کے لیے سرکس پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا ایک مالک بھی ہے جس کا نام سبروف ہے۔ سبروف کے سفید بالوں، گھُلے ہوئے جسم، چیچک کے داغوں اور مُرجھائے ہوئے روکھے چہرے سے ٹارزن پہچان نہ سکا کہ یہ پال وِچ ہے۔ ٹارزن نے اُس سے آ کُوٹ کو خریدنا چاہا مگر اُس نے بیچنے سے اِنکار کر دیا۔ ٹارزن نا اُمّید ہو کر واپس چلا آیا۔ اگلے دِن سرکس اپنے خیمے وغیرہ لپیٹ کر وہاں سے چل دیا۔ ٹارزن نے آ کُوٹ اور اُس کے مالک کا کھوج لگایا مگر کہیں پتہ نہ چلا۔

مگر پال وِچ نے جیک کو اپنا پتہ بتا دیا تھا۔ جیک چوری چھُپے گھر سے نکلا اور اُس محلّے میں پہنچ گیا جہاں پال وِچ آ کُوٹ سمیت رہتا تھا۔ پال وِچ نے اُسے آ کُوٹ کے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ پال وِچ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا

کہ وہ ٹارزن سے انتقام لے گا مگر ابھی تک اس کی کوئی تدبیر اُس کے ذہن میں نہ آئی تھی۔

جیک چھُپ چھُپ کر پال وِچ کے ہاں جانے لگا۔ وہ آ کُوٹ کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ آ کُوٹ اُس سے اِس لیے محبّت کرنے لگا کہ وہ ٹارزن کا بیٹا ہے۔ جیک نے چاہا کہ وہ گوریلوں کی زبان سیکھ جائے۔ آ کُوٹ نے اُسے یہ زبان سکھانی شروع کر دی۔ چند ہفتے میں وہ آ کُوٹ کی باتوں کا مطلب سمجھنے لگا۔

ٹارزن نے پال وِچ کے مکان کا پتا چلانے کے لیے ایک جاسوس مقرّر کر دیا تھا۔ اُس نے پتہ نکال لیا۔ ٹارزن نے ایک بار پھر کوشش کی کہ آ کُوٹ کا مالک اُسے ٹارزن کے ہاتھ بیچ ڈالے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پھر وہ اِس شرط پر بیچنے کو تیّار ہو گیا کہ اُس کے افریقہ جانے کا انتظام میں ہی کروں گا۔ ٹارزن کو اُس کی یہ شرط عجیب تو معلوم ہوئی مگر وہ مان گیا اور سبروف کو مُنہ مانگی رقم دے دی۔ ٹارزن آخری بار آ کُوٹ سے ملا تو اُس نے ٹارزن کو بتا دیا کہ تمہارا بیٹا میرے پاس آتا رہا ہے اور اُس نے مجھ سے گوریلوں کی زبان

سیکھ لی ہے۔

جب جیک کو معلوم ہوا کہ آ کُوٹ افریقہ واپس جا رہا ہے تو اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ افریقہ جائے گا اور وہاں اپنے باپ جیسی زندگی بسر کرے گا۔

جس روز آ کُوٹ کو لندن سے روانہ ہونا تھا، جیک اپنے ماں باپ کے نام خط لکھنے کے بعد پال وِچ کے مکان پر پہنچ گیا۔ آ کُوٹ کو ایک مضبوط رسّی سے باندھا ہوا تھا۔ جیک آ کُوٹ سے باتیں کرنے لگا۔ پال وِچ کے ہاتھوں میں ایک اور رسّی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ "جیک اپنے ہاتھ پیچھے کر لو۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر اجیکس سفر کے دوران میں تنگ کرے تو اُس کے ہاتھ کِس طرح باندھنے چاہئیں۔"

جیک اُس کے جھانسے میں آ گیا اور اُس نے اپنے ہاتھ بندھوا لیے۔ مگر ہاتھ بندھتے ہی پال وِچ نے جیک کو زور سے دھکّا دے کر زمین پر گِرا دیا اور اُس کا گلا گھونٹنے لگا۔ اُس نے کہا۔ "تمھارے باپ نے مجُھے برباد کیا ہے۔

میں تُم سے اِس کا بدلہ لے رہا ہوں۔"

آ کُوٹ نے یہ دیکھا تو غصّے سے غُرّانے لگا۔ اُس نے زور لگا کر رسّی تڑانے کی کوشش کی مگر وہ بہت مضبوط تھی اِس لیے ٹوٹ نہ سکی۔

پال وِچ جیک کا گلا دباتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔"میں تمھیں جان سے مارنے کے بعد تمہارا چہرہ بگاڑ دوں گا۔ پھر تمہارے باپ کو بُلا کر تمہاری لاش دِکھاؤں گا اور یہ کہہ دوں گا کہ گوریلے نے مارا ہے۔"

آ کُوٹ نے اپنا پورا زور لگا کر رسّی تڑالی اور پال وِچ پر آن پڑا۔ پال وِچ فوراً ہی مر گیا۔ آ کُوٹ نے جھک کر جیک کو گود میں اُٹھا لیا۔ رفتہ رفتہ جیک کو ہوش آیا۔ اُس نے آ کُوٹ سے اپنے ہاتھ کھُلوائے۔ پھر اُسی دِن آ کُوٹ کو لے کر افریقہ روانہ ہو گیا۔ اُس نے آ کُوٹ کو جس چال سے سمندر پار کرایا اُس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ اُسے اپنی نقاب پوش دادی امّاں بنا کر ایک پہیّوں دار کرسی پر بٹھا کر بندر گاہ پر پہنچا اور دونوں ایک جہاز پر سوار ہو گئے۔ سفر کے دوران میں دادی امّاں ایک بار بھی اپنے کیبن

سے باہر نہ نکلیں۔ اُن کا کھانا کیبن کے اندر ہی بھیج دیا جاتا تھا۔ اُن کا پیٹ بھی بہت بڑا تھا۔ ایک وقت میں سیروں پھل وغیرہ کھا جاتی تھیں۔ جب جہاز افریقہ کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر پہنچا تو دادی امّاں کو جہاز سے ایک کشتی میں اتار دیا گیا۔ یہ کشتی اُن کو ساحل پر چھوڑ آئی۔ اِس کے بعد کسی نے انہیں کہیں نہ دیکھا۔

اس کے چند گھنٹے بعد آکُوٹ اور جیک دونوں افریقہ کے جنگل میں تھے۔ اب جیک نے آکُوٹ کے جسم پر سے دادی اماں کے زنانہ کپڑے اور نقاب اُتار دی۔ جس سے آکُوٹ بے حد خوش ہوا۔ جیک بھی اِس خیال سے بہت خوش تھا کہ اب وہ زندگی بھر جنگل میں رہے گا اور اپنے باپ کی طرح گوریلے کی زندگی بسر کرے گا۔

# شیرنی سے مُقابلہ

آ کُوٹ اور جیک نے جنگل میں جو پہلی رات گزاری اُس میں اُن کا کسی جنگلی جانور یا وحشی انسان سے پالا نہ پڑا۔

آ کُوٹ جیک کو لے کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور اُس کی شاخوں کے جھنڈ میں دُبک کر لیٹ گیا۔ جیک اُس کے گرم گرم جھبرے جسم سے لگ کر لیٹا رہا مگر رات کی ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے ٹھیک طرح سو نہ سکا۔ اُسے اپنے ماں باپ کی یاد ستاتی رہی اور پھر اچانک اُسے خیال آیا کہ اُس کا آ کُوٹ کے

ساتھ یہاں بھاگ آنا بے وقوفی ہے۔

وہ اپنی عمر سے زیادہ طاقتور تو تھا مگر پھر بھی بچّہ ہی تھا۔ افریقہ کے جنگل میں رہنے کے شوق میں اتنی دور آ گیا تھا مگر اب ماں باپ یاد آ رہے تھے تو اُن کی پریشانی کا خیال کر کے واپس جانے کی سوچنے لگا۔

اگلی صُبح جب سورج نکلا اور دھوپ کی سینک سے جسم میں تازگی آئی تو وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور آ کُوٹ کو جھنجھوڑ کر جگانے لگا۔ اب وہ رات کی سب باتیں بھول چکا تھا۔

جب آ کُوٹ جاگا تو جیک چلّا کر اُس سے بولا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ چلو وہاں کُچھ کھانے کو ڈھونڈیں۔" وہ اُس میدان کی طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں سوکھے درخت اور کھردری چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ اُسے وہاں پہنچنے کی اتنی جلدی تھی کہ بات پوری کرتے ہی درخت سے نیچے کود گیا۔ مگر آ کُوٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے پہلے سُو سُو کر کے ہوا کو سونگھا اور جب یہ اطمینان کر لیا کہ آس پاس کوئی خطرناک حیوان نہیں ہے تو آہستہ

سے زمین پر اُترا اور جیک کے پاس کھڑا ہو گیا۔

پھر اُس سے کہنے لگا۔ ”جو دیکھے بھالے بغیر زمین پر اُتر جاتے ہیں اُن کو شیر کھا جاتے ہیں مگر جو اُترنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ بھال لیتے ہیں وہ زندہ رہتے ہیں۔“

یہ جنگل کی زندگی کا پہلا سبق تھا جو آکُوٹ نے جیک کو پڑھایا۔ اِس کے بعد دونوں ایک میدان میں پہنچے۔ گوریلے نے جیک کو وہ جگہیں دِکھائیں جہاں زمین کھودنے سے کیڑے مکوڑے نکلتے تھے۔ مگر جیک نے کیڑے مکوڑے کے نام پر ناک بھوں چڑھا کر مُنہ پھیر لیا۔ ایک جگہ کسی پرندے کے انڈے ملے وہ اس نے کچّے ہی کھا لیے۔ آکُوٹ نے زمین کھود کر کچھ جڑیں نکالیں۔ وہ بھی جیک نے کھالیں۔ ایک جگہ پانی مل گیا۔ اُس میں سے بدبُو آرہی تھی مگر جیک کا پیاس کے مارے بُرا حال تھا اس لئے اسی کو ڈگڈگا کر پی گیا۔ آکُوٹ تنا کھڑا رہا تھا کہ کوئی جانور آجائے تو اُس سے نمٹے۔

جب جیک پانی پی چکا تو آکُوٹ نے خود پینا شروع کیا مگر اِس سے پہلے جیک

کو ہدایت کر دی کہ چوکس کھڑا رہے۔ وہ پانی پینے میں بھی سر اُٹھا اُٹھا کر جھاڑیوں کے اس جھُنڈ کی طرف دیکھتا رہا جو وہاں سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔

آ کُوٹ پانی پی کر فارغ ہو گیا تو جیک سے پوچھنے لگا۔ ”آس پاس کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟“

”کوئی نہیں ہے۔“ جیک نے جواب دیا۔ ”تمہارے پانی پیتے میں مجھے کہیں کوئی جاندار نظر نہیں آیا۔“ آ کُوٹ بولا۔ ”جنگل میں صرف آنکھوں سے کام نہیں چل سکتا۔ یہاں تو جان بچانے کے لیے کانوں اور ناک سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ جب ہم یہاں پہنچے تھے اُس وقت ہرن پانی کے کنارے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ پانی کے اس کنارے پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہرن بھاگ کھڑے ہوتے۔ مگر پرلے کنارے پر کوئی خطرناک جانور ہو سکتا ہے۔ ہوا ہمارے رُخ کی ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں خطرے کی بُو نہ سُنگھائی دے اِس لیے میں نے اپنے کانوں سے کام لیا۔“

”مگر۔“ جیک نے پوچھا۔ ”خطرے کے آثار نہیں پائے؟“

”پائے۔“ آکُوٹ نے جواب دیا۔ ”لمبی گھاس کے قریب، جھاڑیوں میں، ایک شیر دُبکا بیٹھا ہے۔“

”ارے۔“ جیک نے حیران ہو کر کہا۔ ”شیر مُجھے تو نظر نہیں آ رہا۔“

”تمہیں نظر نہ آ رہا ہو گا۔“ آکُوٹ کہتا رہا۔ ”مگر وہاں موجود ہے۔ مُجھے پہلے اُس کے ہلکے سے سانس لینے کی آواز سُنائی دی، پھر میں نے غور سے دیکھا تو لمبی گھاس ہلتی دکھائی دی۔ وہ دیکھو۔“

جیک نے گھور کر دیکھا پھر بولا۔ ”ہاں وہ لیٹا ہے۔ اُس کا سر ہماری طرف ہے۔ کیا وہ ہماری طرف دیکھ رہا ہے؟“

”ہاں!“ آکُوٹ نے جواب دیا۔ اُس کی نظریں ہم ہی پر ہیں مگر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ شکار کیے ہوئے جانور پر لیٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اُس کا پیٹ ناکوں ناک بھرا ہوا ہے۔ وہ ہماری طرف صرف یہ معلوم کرنے کے لیے

دیکھ رہا ہے کہ ہم یہاں کس لیے کھڑے ہیں۔ دو چار منٹ بعد پھر شکار کھانا شروع کر دے گا یا اُٹھ کر اس جوہڑ پر پانی پینے آئے گا۔ جیک آکُوٹ کی باتیں بڑی توجّہ سے سُن رہا تھا۔ "اچھا آؤ۔" آکُوٹ کہنے لگا۔ "ہم شیر کے گرد چکّر کاٹ کر اُس کی بُو سُونگھیں۔ تمہیں بُو سُونگھنے کا طریقہ آنا چاہیے۔ مگر درخت کے قریب رہنا کیونکہ شیر بعض دفعہ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ اپنے کان، ناک اور آنکھیں کھُلی رکھنا۔ یاد رکھو! ہر جھاڑی، ہر درخت اور گھاس کے ہر جھُنڈ میں کوئی دُشمن چھُپا ہو سکتا ہے۔"

آکُوٹ نے بات ختم کر کے جوہڑ اور شیر کے گرد چکّر کاٹنا شروع کر دیا۔ جیک اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب وہ اپنے پچھلی رات کے سب ارادے بھول بھال گیا۔ جو مزہ اِس زندگی میں تھا وہ لندن میں کہاں تھا۔

دونوں شیر کے پیچھے، اُس سے کُچھ فاصلے پر تھے کہ جیک کو ایک گوشت خور حیوان کی بُو سُنگھائی دی۔ اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ

اِس بُو کو پہچان گیا چنانچہ فوراً چوکس ہو گیا۔

اب وہ ایک لڑکا نہیں تھا، ایک شکاری تھا۔

وہ آکُوٹ کے پیچھے پیچھے چلتے میں مُڑ مُڑ کر دیکھتا گیا۔ اُسے یہ توقع تھی کہ شیر اپنے شکار پر سے اُٹھے گا تو ہماری نظروں کے سامنے آ جائے گا اِس طرح وہ پیچھے رہ گیا۔ اچانک اُس نے آکُوٹ کی تیز چیخ سُنی جو اُس کو خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ جیک نے فوراً مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے راستے میں صرف دس قدم پر ایک شیرنی لیٹی تھی اور اس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شیرنی سے بیس قدم اِدھر آکُوٹ کھڑا دھاڑ دھاڑ کر ایک طرف تو جیک کو خبردار کر رہا تھا، دوسری طرف شیرنی کو ڈانٹ ڈپٹ رہا تھا۔

مگر شیرنی جیک پر نظریں گاڑے رہی جو اُس کے اور اُس کے نر کے درمیان کھڑا تھا۔ شیرنی جلد غصّے میں آجایا کرتی ہے۔ آکُوٹ کے ڈانٹنے سے اُسے تاؤ آ گیا۔ وہ غرّا کر جیک کی طرف بڑھی۔ آکُوٹ چلّایا۔

”درخت پر۔“ اِدھر شیرنی جیک پر جھپٹی، اُدھر وہ مُڑ کر بھاگا۔ درخت سے چند ہی قدم دُور تھا۔ دس گز اُوپر اُس کا ایک تنا لٹکا ہوا تھا۔ جب جیک نے اُچھل کر اُسے پکڑا تو شیرنی اُس پر آ پڑنے کے لیے اُچھلی۔ جیک بندر کی طرح چھلانگ مار کر اُوپر چڑھ گیا۔ شیرنی کا پنجہ اُس پر پڑا تو صحیح مگر صرف کھرونچا لگا کر رہ گیا۔

شیرنی کا ناخن جیک کی پتلون کی پیٹی میں ہُک کی طرح اٹکا تھا۔ جس سے پیٹی پتلون سے الگ ہو گئی تھی مگر شیرنی ناکام رہی اور زمین پر گر پڑی۔

جیک آدھا ننگا تو ہو گیا مگر شیرنی کے ہاتھ نہ آیا۔ شیرنی نے ایک بار پھر چھلانگ ماری مگر جیک اور اُوپر چڑھ گیا۔ شیرنی اب کے بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

آکُوٹ قریب کے ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا اور شیرنی کی توجّہ ہٹانے کے لیے اس کو طرح طرح ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔

جیک بھی اُس کی نقّالی کرتے ہوئے شیرنی کو ڈانٹنے اور دھمکانے لگا مگر اس

نے دیکھا کہ لفظوں کے ہتھیاروں سے کام نہیں بن رہا ہے تو یہ سوجھی کہ کوئی بھاری بھر کم چیز شیرنی پر دے مارنی چاہیے۔

مگر جن چیزوں تک اس وقت ہاتھ پہنچ سکتا تھا وہ درخت کی شاخیں تھیں اور وہ بھی سوکھی ہوئی۔ جیک نے سوچا اور کچھ نہیں ہے تو یہی سہی۔ شیرنی نیچے کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیک نے بہت سی شاخیں اکٹھی کیں اور شیرنی کے مُنہ پر دے ماریں۔

شیرنی پر اِس جھاڑ جھنکاڑ کی ہلکی سی چوٹ کا کیا اثر ہوتا۔ وہ غرّاتی ہوئی درخت کے تنے کے گرد چکّر کاٹتی رہی مگر جب دیکھا کہ شکار تک پہنچنا مُشکل ہے تو وہاں سے ہٹ کر اُسی جھاڑی میں غائب ہو گئی جس میں اس کا نر تھا۔

آ کُوٹ اور جیک درختوں سے اُتر کر آگے چلے۔

آ کُوٹ نے جیک کو بتایا کہ وہ شیر کی طرف ساری توجّہ لگا دینے کی وجہ سے شیرنی کو نہ دیکھ سکا اور یہ نصیحت کی کہ آئندہ سب طرف کا دھیان رکھا

کرے۔ اس رات جیک کو پچھلی رات سے بھی زیادہ سردی لگی۔ اُس نے دل میں ٹھان لی کہ ساحل پر پہنچ کر انسانوں کی بستی ڈھونڈے گا۔

ایک مہینے تک دونوں اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ جیک نے جنگل کے قانون سیکھ لیے۔ اب اُس کا جسم وہاں کی زندگی کا عادی بننے لگا۔ اُسے درختوں کو پھلانگنے اور زیادہ سے زیادہ بلندی تک جانے میں کوئی دِقّت نہ ہوتی۔ آخر کو ٹارزن کا پُوت تھا۔

دھوپ میں رہنے کی وجہ سے اُس کی نرم اور سفید کھال سخت اور بھوری ہو گئی تھی۔ ایک دِن اُس نے ایک ندی میں نہانے کے لیے اپنی جیکٹ اور قمیض اُتاری تو ایک بندر یہ دونوں کپڑے لے بھاگا۔ اب وہ ننگا ہی رہنے لگا۔

ایک دفعہ آ کُوٹ اور جیک ساحل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آ کُوٹ کسی گوریلا قبیلے کی تلاش میں تھا مگر جیک اِس فکر میں تھا کہ انسانوں کی کسی بستی میں پہنچ جائے۔

وہ ایک دریا کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے کہ ایک گاؤں نظر آیا۔ انسانوں کے کُچھ بچّوں کو پانی میں کھیلتے دیکھ کر جیک کا دل مچل گیا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ کھیلے۔ وہ اُن کی طرف لپکا۔ آ کُوٹ نے اُسے روکا مگر وہ اُس کا ہاتھ جھٹک کر بچّوں کی طرف دوڑ گیا اور زور زور سے چلّانے لگا۔

اس کی آواز پر بچّوں نے سر گھمائے اور اُسے دیکھ کر چیخیں مارتے ہوئے گاؤں میں گھُس گئے۔ وہاں سے بیس حبشی نیزے اور ڈھالیں سنبھالے ہوئے نکل آئے اور نعرے مارتے ہوئے جیک کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ آدم خوروں کی بستی تھی۔ جیک رُک کر کھڑا ہو گیا۔ آ کُوٹ چلّا رہا تھا کہ اُلٹے قدموں بھاگ آؤ ورنہ یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ جیک نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور گاؤں والوں سے چیخ کر کہا۔ ”میں لڑنے بھڑنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تمہارے بچّوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔“ مگر وہ اس کی بات نہ سمجھے اور غصّے میں آ کر اس کی طرف نیزے پھینکنے لگے۔

جیک واپس آ کُوٹ کے پاس پہنچ گیا، جس نے اُسے سمجھایا کہ ہم دونوں

ان حبشیوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اب یہ ہمارا دُور تک پیچھا کریں گے۔ اِس لیے درختوں در ختوں بھاگنا چاہیے۔

جیک چُپ چاپ اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اُسے اِس بات کا بڑا ملال تھا کہ اُس نے انسانوں سے ملنے جلنے کی جو کوشش کی اُس کا یہ انجام ہوا۔ اپنی اِس ناکامی سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ جنگل کے جانور ہی اُس کے ساتھی ہیں۔

گاؤں والے نعرے مارتے ہوئے اُن کا پیچھا کر رہے تھے۔ جیک کو ایک بات سوجھی۔ اُسے کپڑوں اور ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ سوچا اِن سے کپڑے اور ہتھیار چھیننے چاہییں۔ اپنا کام بھی بنے گا اور اُن سے بدلہ لینے کا موقع بھی ملے گا۔

وہ آ کُوٹ سے پیچھے رہ گیا۔ جب گاؤں والے میل بھر تک پیچھا کرنے کے بعد واپس ہونے لگے تو وہ اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کُچھ دُور جانے کے بعد حبشیوں میں سے ایک شخص پیچھے رہ گیا۔ جیک کی باچھیں کِھل گئیں۔ وہ آگے بڑھ کر اُس پر جا پڑا اور اُس سے نیزہ اور ڈھال چھین لی۔

ادھر آ کُوٹ نے جب دیکھا کہ جیک نہیں ہے تو اُسے ڈھونڈنے کے لئے پلٹا مگر چند ہی قدم گیا تھا کہ ایک عجیب شکل کو درختوں میں حرکت کرتے دیکھ کر حیرت سے رُک کر کھڑا ہو گیا۔

یہ جیک تھا۔ اُس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ کندھے پر ڈھال لٹک رہی تھی اور کمر میں ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ جیک آ کُوٹ کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس کے پاس آیا اور بڑے فخر سے اسے اپنا کارنامہ سنایا۔

پھر بولا۔ ”اب میں شیر کو بتا دوں گا کہ مُجھ سے دُشمنی کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔“ آ کُوٹ مُسکرا مُسکرا کر اُس کی باتوں پر سر ہلاتا رہا۔

وہ ساحل کی طرف چلتے رہے۔ جیک نے نیزہ پھینکنے کی مشق کر کے اُسے نشانے پر بٹھانا سیکھ لیا۔ اب وہ قدموں کے نشان پہچاننے لگا تھا اور بُو سونگھ کر بتا دیتا تھا کہ کون سا گوشت خور جانور ہے، وہ اپنی طرف آ رہا ہے یا پرے ہٹ رہا ہے۔ بہت جلد اُسے یہ بتا دینا بھی آ گیا کہ جِدھر سے ہوا آ رہی ہے اُدھر دو شیر ہیں یا چار۔

اِن میں سے بہت سی باتیں آ کُوٹ نے ہی سکھائیں۔ مگر سیکھنے میں جیک کو اُس خُو سے بھی بڑی مدد ملی جو باپ سے ورثے میں پائی تھی۔

وہ جنگل کا شیدائی بن گیا اور اُسے ان جان لیوا حیوانی دُشمنوں کو زیر کرنے میں لطف آنے لگا جو رات دِن، دوسرے جانداروں کو شکار بنانے کے لیے تاک لگائے رہتے تھے۔

سفر کرتے رہنے، شکار مارنے اور درختوں پر چڑھنے کی لگاتار مشق سے جیک کے پٹھّے مضبوط ہو گئے اور وہ پہلے سے زیادہ پھُرتیلا بھی ہو گیا۔ اِس طاقت اور پھُرتی کے گھمنڈ میں وہ دُشمن کی طرف سے بے پروا سا رہنے لگا۔ جنگل میں اکڑ کر چلتا اور اِس خیال سے نچنت رہنے لگا کہ جو بھی آئے گا اُس سے نمٹ لوں گا۔ آ کُوٹ شیر کی بُو سونگھتے ہی لپک کر کسی درخت پر چڑھ جاتا مگر جیک شیر کو اپنے سامنے کُچھ نہ سمجھتا اور یا تو اُس کا مذاق اُڑاتا یا دلیری سے اُس کے پاس سے گُزر جاتا۔

# شیر کو چکما

بہت دِن تک تقدیر جیک کا ساتھ دیتی رہی۔ اُن کی جِن شیروں سے مُڈ بھیڑ ہوئی وہ یا تو اتّفاق سے اُس وقت ناکوں ناک پیٹ بھرے ہوئے تھے یا اِس عجیب مخلوق کی دیدہ دلیری پر اِتنے سٹپٹا گئے کہ حملہ کرنے کا خیال ہی دِل میں نہ لا سکے۔ وجہ کچھ ہو مگر بہت دفعہ ہوا یہی کہ جیک کسی بڑے سارے شیر کے پاس سے صرف چند قدم کے فاصلے سے گُزر گیا مگر شیر آنکھیں پھاڑے دیکھتا ہی رہا۔ اُس نے حملہ نہ کیا۔

مگر سب شیر ایک طرح کے نہیں ہوا کرتے۔ ایک دِن جیک کا ایک ایسے شیر سے پالا پڑ گیا جو پچھلے شیروں سے مختلف تھا۔

جیک ایک تنگ سے میدان سے گُزر رہا تھا جس میں جھاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ اُگے ہوئے تھے۔ آ کُوٹ، اُس کے بائیں ہاتھ پر، اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ اچانک جیک کو شیر نظر پڑ گیا۔

اس نے ہنستے ہوئے چیخ کر آ کُوٹ سے کہا۔ "بھاگو چاچا جی، میری دائیں جانب جھاڑیوں میں شیر دُبکا بیٹھا ہے۔ تُم فوراً درخت پر چڑھ جاؤ۔ میں اِس حیوان کو ٹھکانے بھی لگاؤں گا اور ہماری حفاظت بھی کروں گا۔"

اور یہ کہتے ہی اُس نے اُس جھاڑی کا رُخ کیا جس میں شیر چھُپا بیٹھا تھا۔

آ کُوٹ چلّایا کہ واپس آ جاؤ۔ مگر جیک نے اُس کے چلّانے کے جواب میں اِس طرح نیزہ ہلا کر جنگی ناچ ناچا، جیسے شیر کو اپنے آگے کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ شیر کی طرف بڑھا چلا گیا۔ شیر اچانک غرّا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت جیک، شیر سے صرف دس قدم پر تھا۔

یہ شیر بہت اُونچے قد کا تھا۔ اُس کے کندھوں پر گھنی ایّال تھی۔ جبڑے بڑے بڑے تھے اور اُن جبڑوں کے دانت بڑے خوفناک تھے۔ اِس وقت شیر کی آنکھیں، جن کا رنگ پیلا تھا، اُس پر جمی ہوئی تھیں اور اُن میں نفرت کی چمک تھی۔ وہ حملے کے لیے بالکل تیّار تھا۔

جیک فوراً سمجھ گیا کہ یہ شیر اُن شیروں سے مختلف ہے، جِن سے اُس کا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ اِدھر اُس کے ہاتھ میں صرف ایک نیزہ تھا جو شیر کے مُقابلے کے لیے کافی نہیں تھا مگر اب وہ پیچھے نہ ہٹ سکتا تھا۔ سب سے قریب کا درخت بھی اُس سے کئی گز پرے تھا۔ وہ آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کر پائے گا کہ شیر اُس پر آپڑے گا۔

شیر سے صرف چند فٹ پرے ایک جھاڑی تھی۔ یہ جیک کو شیر کے پنجے سے بچا سکتی تھی۔ مگر شیر اُس کے اور جیک کے درمیان ہی کھڑا تھا۔

جیک کو اچانک ایک تدبیر سوجھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اُسے ایسی تدبیر پر ہنسی آجاتی مگر اِس وقت تو لے دے کے یہی ایک تدبیر ایسی تھی کہ اگر

چل جائے تو اُس کی جان بچ جاتی ورنہ ظاہر تھا کہ شیر اس کا تیا پانچا کر دے گا۔

جیک نے شیر کی طرف چھلانگ ماری۔ اُدھر شیر، اِدھر آ کُوٹ، دونوں حیران تھے کہ یہ کیا کر رہا ہے۔

شیر اُس کے اچانک چھلانگ مارنے سے ایک لمحے کے لیے حیرت سے بے حرکت سا ہو گیا۔ جیک نے اُسی ایک لمحے میں ہائی جمپ لگائی۔

وہ نیزہ تانے ہوئے شیر پر چڑھ دوڑا۔ آ کُوٹ حیرت اور دہشت سے چیخ اُٹھا۔ شیر اپنی گول گول آنکھیں پھاڑے تن کے اِس طرح کھڑا ہو گیا جیسے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اُس پر پنجے مارنے کو تیّار ہے۔ مگر جیک نے قریب پہنچ کر نیزہ زمین پر رکھ دیا اور پوری قوّت سے اُچھل کر شیر کے سر پر سے گزر کر خاردار جھاڑی کے اندر جا گرا۔

آ کُوٹ نے ہائی جمپ کا اتنا شاندار کارنامہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ خود تو درخت میں محفوظ تھا ہی، اب اُس کا ساتھی بھی جھاڑی میں پہنچ کر محفوظ ہو

گیا۔ اب اُس نے شیر کو چیخ چیخ کر ڈانٹنا اور پھٹکارنا شروع کر دیا۔

ادھر جیک کی جان تو بچ گئی مگر اُس کا جسم جگہ جگہ سے کٹ پھٹ کر لہو لہان ہو گیا تھا۔ پھر بھی یہ شیر کے مُنہ میں چلے جانے سے تو بہتر ہی تھا۔ وہ اِس کانٹے دار جھاڑی میں دُبک کر بیٹھ گیا۔

شیر جھاڑی پر پہرا دینے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یہاں سے ٹلنے کا نام نہ لے گا۔ پھر کہیں ایک گھنٹے بعد وہاں سے ہٹ کر بڑی شان سے قدم اُٹھاتا ہوا میدان کی طرف چلا گیا۔ جب وہ کافی دُور جا چکا تو جیک جھاڑی سے نکلا۔ اُس کے زخم اچھے ہونے میں بہت دِن لگے۔ اُس کو زندگی بھر کے لیے سبق مل گیا کہ اِترانا اور اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنا اچھا نہیں ہوتا۔

زخم اچھے ہونے میں گوریلے کا بڑا حصّہ تھا۔ وہ روز جیک کے زخم چاٹتا تھا۔ اِسی سے وہ اتنے جلد بھر گئے ورنہ خبر نہیں کیا گت بنتی۔

جب جیک بالکل اچھا ہو گیا تو وہ دونوں پھر ساحل کی طرف روانہ ہوئے۔ جیک یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی انسانی بستی ضرور ملے گی۔

آخر ایک جگہ اُسے ایک سفید انسان کے جوتوں کے نشان نظر آ ہی گئے۔ وہ اس راستے پر تھے جو شمال کی جانب ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ بوٹوں کے اِن نشانوں کے ساتھ اور بہت سے آدمیوں کے پاؤں کے نشان بھی تھے۔ اِس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ انسان کسی ایسی انسانی بستی کا اتا پتا جانتے ہیں جو ساحل پر یا اُس کے آس پاس آباد ہیں اور شاید وہ اسی طرف جا رہے ہوں۔ کچھ ہو، اُن کو جا لینا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو اپنے جیسے اور انسانوں سے ملاقات کرنے کا موقع ہی مل جائے گا۔

یہ سب باتیں سوچ کر جیک خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

مگر آ کُوٹ اُس کی اِس خوشی میں شریک نہیں تھا۔ وہ انسانوں سے دُور ہی رہنا چاہتا تھا۔ اُس کے خیال میں تو جیک گوریلا تھا، کیونکہ اس کا باپ گوریلوں کا بادشاہ تھا۔

اس نے جیک کو سفید انسانوں کے پیچھے جانے سے روکا اور کہا کہ ہم بہت جلد اپنے کسی قبیلے سے جا ملیں گے جو اسے اس کے باپ کی طرح بادشاہ بنا

لے گا۔ مگر جیک نہ مانا۔ وہ اس پر اَڑ گیا کہ سفید انسانوں سے ملاقات کر
کے رہے گا۔ کیونکہ اسے ان کے ہاتھ، اپنے ماں باپ کو خط بھیجنا ہے۔
آ کُوٹ اس کی یہ باتیں سُن کر تاڑ گیا کہ وہ انسانوں کی دنیا میں واپس جانا
چاہتا ہے۔

وہ بہت غمگین ہوا کیونکہ اسے اُمّید تھی کہ جیک اس سے کبھی جدا نہ ہو گا
مگر پھر بھی وہ ٹارزن کے بیٹے کا وفادار رہا اور جیک کے ساتھ اس سفر پر
جانے کو تیّار ہو گیا جو وہ سفید انسانوں تک پہنچنے کے لیے کر رہا تھا۔

پاؤں کے نشانوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ زیادہ دُور نہیں ہیں۔ جیک
اس بات سے اتنا جوش میں آ گیا تھا کہ آ کُوٹ کے آگے آگے بھاگا بھاگا چلا
جا رہا تھا اور آخر اس نے انسانوں کے اس قافلے کو دیکھ لیا۔

ایک درجن حبشی، جن کی پیٹھیں اس سامان کے بوجھ سے دُہری ہوئی جا
رہی تھیں جو اُن پر لادا گیا تھا، گرتے پڑتے چلے جا رہے تھے۔ وہ شاید تیز نہ
چل سکنے یا تھک جانے کی وجہ سے قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے۔ قافلے کے

حبشی سپاہی ان کو تیز چلانے کے لیے ان پر ڈنڈے برسا رہے تھے۔ جب وہ گر پڑتے تو ان کو ٹھوکریں مارتے، پھر بڑی سختی سے اُٹھا کر کھڑا کرتے اور دھکّے دے دے کر آگے بڑھنے پر مجبور کرتے۔ اُن کے دائیں بائیں ایک ایک سفید آدمی بھی چل رہا تھا۔

جیک انہیں آواز دینے کو ہوا مگر آواز اس کے منہ سے نہ نکلی کیوں کہ اس نے دیکھا کہ یہ دونوں سفید آدمی بے چارے کالے آدمیوں کی ننگی پیٹھوں پر بڑی بے رحمی سے کوڑے برسا رہے ہیں۔

قافلے کے کالے سپاہی اور سفید انسان بار بار اس طرح پیچھے مُڑ کر بھی دیکھتے جا رہے تھے جیسے کسی کے حملے کا ڈر ہے۔

تھوڑی دیر بعد آکُوٹ بھی جیک سے آملا اور جب اُس نے کالے آدمیوں کو اِس طرح پٹتے ہوئے دیکھا تو آہستہ سے غرّایا۔ پھر اُس نے جیک کی طرف اِس طرح دیکھا جیسے اُس سے پوچھتا ہے کہ اب تم دوڑ کر اِن لوگوں کے پاس کیوں نہیں پہنچ جاتے؟ جیک اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ کہنے لگا۔ ”یہ

لوگ شیطان ہیں۔ میں اِن کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ یہ کالے آدمیوں کو

بہت بری طرح مار پیٹ رہے ہیں۔"

ایک لمحہ بھر کر بولا۔ ”ہاں، میں ان سے قریب کی کسی بندر گاہ کا پتا ضرور پوچھوں گا۔ اس کے بعد ان سے الگ ہو جاؤں گا۔“

گوریلے نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

جیک قافلے کی طرف چلا مگر ابھی اس سے سو گز اِدھر ہی تھا کہ سفید سپاہیوں میں سے ایک نے اسے دیکھ لیا اور ڈر کر اس پر فائر کر دیا۔ مگر گولی جیک کو لگنے کے بجائے اُس جھاڑ جھنکار میں گھُس گئی جو اس کے پاؤں میں پڑا تھا۔ اُس کے بعد دوسرا سفید آدمی اور کالے سپاہی بھی پاگلوں کی طرح جیک پر فائر کرنے لگے۔ جیک ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ اس لیے اس کے ایک بھی گولی نہ لگی۔ پھر وہ اور آکُوٹ وہاں سے ہٹ آئے۔

جیک اس واقعے سے بہت رنجیدہ ہوا۔ اس نے خود سے کہا۔ انسان مُجھ سے ڈر کر بھاگنے لگتے ہیں۔ حیوان مجھے پھاڑ کھانے کو تیّار ہو جاتے ہیں۔ کیا دنیا کی ساری مخلوق میری دُشمن ہے؟

گوریلا اس کے اور قریب ہو گیا اور بولا۔ ”تم گھبراؤ نہیں۔ گوریلے،

آ کُوٹ کے دوست کے بیٹے کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں گے۔ ہمیں اُن کی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔"

یہ قافلہ، جس نے جیک پر فائر کیے تھے، کِن لوگوں کا تھا اور کہاں جارہا تھا؟

جس طرح سبروف نے ٹارزن کے بیٹے کو اغوا کیا تھا۔ اِسی طرح اس سے چھ سال پہلے ایک افریقی سردار نے ایک فرانسیسی کپتان کی لڑکی کو اغوا کر لیا تھا۔ یہ کپتان فرانس کی حکومت کی طرف سے اس سردار کو سزا دینے گیا تھا کیونکہ اُس نے ایک فرانسیسی کو مروادیا تھا۔ فرانسیسی کپتان نے لڑکی کو ڈھونڈ نکالنے والے کے لیے بڑا بھاری انعام مقرّر کیا تھا اور انعام کے لالچ میں دو فرانسیسی جانسن اور مالبن افریقہ پہنچ گئے تھے۔ یہ لڑکی کے اغوا کے پانچ برس بعد کی بات ہے۔

ان دونوں نے ایک گاؤں کے باہر اپنے خیمے لگائے اور گاؤں کے سردار سے ملنے گئے۔ انہوں نے ایسا ظاہر کیا جیسے تاجر لوگ ہیں اور ہاتھی دانت خریدنے آئے ہیں۔

جب وہ گاؤں کے سردار سے باتیں کر رہے تھے تو انہوں نے ایک لڑکی کو ایک جھونپڑی کے دروازے میں سے باہر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ وہ صورت سے سفید لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ جان سَن نے اپنے ساتھی کو کہنی سے ٹھوکا دیا۔ گاؤں کے سردار نے اُس کی یہ حرکت دیکھ لی اور مُڑ کر دیکھا تو لڑکی کو باہر جھانکتا پایا۔ اُس نے دونوں سفید انسانوں کو اُسی وقت گاؤں سے بھگا دیا اور لڑکی کو اجنبیوں کے سامنے باہر آنے سے سختی سے منع کر دیا۔

جانسن اور مالبن نے لڑکی کو سردار کے قبضے سے نکالنے کے لیے یہ ترکیب سوچی کہ اس گاؤں کے ایک آدمی کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملایا جائے اور اس کے ذریعے لڑکی اُٹھوالی جائے۔ وہ آدمی راضی ہو گیا اور روپیہ بھی وصول کر لیا۔ مگر ایک آدمی نے جو بوری ان دونوں کو پہنچائی، اُسے کھولنے پر معلوم ہوا کہ اُس میں اسی شخص کی لاش ہے جسے روپیہ دے کر انہوں نے اپنے ساتھ ملایا تھا۔

پانچ منٹ بعد جانسن اور مالبن کا قافلہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سے ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ قافلے کا ہر آدمی ڈر رہا تھا کہ گاؤں کا سردار ضرور حملہ کرے گا۔ اس لئے مُڑ مُڑ کر دیکھتا تھا۔

اس عالم میں جب ان لوگوں نے ایک ننگے سفید آدمی کو جنگل سے نکلتے ہوئے دیکھا تو خوف کے مارے ان کے حواس رخصت ہو گئے اور انہوں نے پاگلوں کی طرح فائر کرنے شروع کر دیے۔ جیک سب سے پہلے مالبن کو نظر آیا تھا۔ جب وہ نظروں سے چھُپ گیا تو پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ صرف مالبن نے اسے دیکھا تھا۔ وہ کسی اور کو نظر نہ آیا تھا۔ اس لیے سب نے یہی سمجھا کہ کوئی بھُوت تھا۔ جب آ کُوٹ اور جیک درختوں میں غائب ہو گئے تو قافلے والوں نے موقع پر پہنچ کر دیکھا بھالا۔ وہاں کسی آدمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

# گوریلوں سے مُڈ بھیڑ

اس واقعے کو ایک سال گُزر چکا تھا۔ اب جیک کے پٹھّے، جو پہلے ہی کافی مضبوط تھے، فولاد کی چانپیں بن چکے تھے۔ اور درختوں بھاگنے کو تو اُس نے ایک فن بنالیا تھا۔ کہنے کو وہ بچّہ تھا مگر اُس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ آ کُوٹ جیسا طاقتور گوریلا، جس سے وہ کشتی کرتا رہتا تھا، اُس سے پناہ مانگنے لگا تھا۔

وہ دونوں کسی ایسے گوریلا قبیلے کی تلاش میں پھِر رہے تھے جو اُن کو اپنے

میں ملا لے۔ آخر اُن کی مُراد پوری ہو ہی گئی۔ ایک گھنے جنگل میں، اُس کے دُھر اندر، ایک جگہ ایسا اکھاڑا دکھائی دیا جس میں گوریلے ڈم ڈم کی رسم ادا کیا کرتے ہیں۔

پہلے انہیں بہت دُور سے گوریلوں کے ڈھول کی آواز سُنائی دی۔ اُس وقت وہ ایک بڑے سارے درخت پر سو رہے تھے۔ اس آواز کی گونج سے اُن کی آنکھ کھُل گئی۔ آ کُوٹ اُٹھتے ہی غرّایا۔ ''گوریلے ڈم ڈم کا ناچ رہے ہیں۔ آؤ ٹارزن کے بیٹے، کوراک، ہم اپنی نسل کے لوگوں سے ملنے چلیں۔''

جیک کا یہ نام آ کُوٹ نے اس لیے رکھا تھا کہ وہ جیک کا لفظ آسانی سے نہ لے سکتا تھا۔ گوریلوں کی زبان میں کوراک کے معنی ہیں خُونی یا ہلاکو۔

کوراک نے اُٹھ کر انگڑائی لی۔ آ کُوٹ پنجوں کے بل بیٹھا آہستہ آہستہ غرّا رہا تھا۔ یہ گوریلوں سے ملنے کے شوق میں بے چین ہونے کا اظہار تھا۔ کوراک بھی اُسی طرح غُرّانے لگا۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔

ڈھول کی آواز ہر لمحہ قریب آتی گئی۔ آخر کار اُنہیں ناچتے ہوئے گوریلوں کی غرّاہٹ سنائی دینے لگی اور اُن کی ناکوں میں اپنے ہم نسلوں کی بُو بھی آئی۔ پھر کچھ دُور جانے کے بعد ایک جگہ درختوں کے پتّوں میں سے گوریلے، چاندنی میں، ایک ڈھول کے گرد ناچتے دکھائی دیے۔

آ کُوٹ جانتا تھا کہ گوریلے جب تک ناچ ختم کر کے کھا پی نہ لیں اُس وقت تک اُن کے سامنے نہیں جانا چاہیے۔ چُپ چاپ کھڑا رہا۔

جب رات ڈھلنے لگی تو گوریلوں نے ناچنا بند کر کے کھانا پینا شروع کر دیا۔ آ کُوٹ نے بتایا کہ یہ نیا بادشاہ چُننے کی رسم ادا کی جارہی ہے۔ اُس نے ایک بھاری بھرکم گوریلے کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ہے بادشاہ۔

جب گوریلے پیٹ بھر چکنے کے بعد سونے کے لیے درختوں پر چڑھنے لگے تو آ کُوٹ اکھاڑے کے ایک سِرے پر لٹکی ہوئی شاخ پر کھڑے ہو کر غرّایا۔ فوراً ہی بہت سے گوریلے اُچھل کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جنگل کی طرف دیکھنے لگیں۔

سب سے پہلے اُن کے بادشاہ کو آکُوٹ اور اُس کا ساتھی نظر آئے۔ وہ پہلے تو غرّایا، پھر ہلتا جلتا اُن کی طرف بڑھا۔ اُس کے بال اِس طرح کھڑے ہو گئے تھے جیسے لڑنے کو تیّار ہے۔ اِن دونوں سے کچھ دُور اُدھر رُک کر اُس نے اپنے جسم کو جھلاتے ہوئے دانت نکال لیے اور اس کی غرّاہٹ بڑھتی گئی۔

آکُوٹ سمجھ گیا کہ گوریلا حملہ کرنے کے لیے تیّار ہو رہا ہے مگر وہ لڑنے نہیں آیا تھا۔ وہ ان گوریلوں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔

اس نے کہا۔ ”میں آکُوٹ ہوں۔“ یہ ٹارزن کا بیٹا کوراک ہے، جو گوریلوں کا بادشاہ تھا۔ میں بھی گوریلوں کا بادشاہ رہ چکا ہوں۔ ہم لڑنے نہیں آئے۔ تمہارے ساتھ رہنے سہنے آئے ہیں۔ بادشاہ نے انہیں خُونی نظروں سے گھورا۔ ایک تو وہ ابھی ابھی بادشاہ بنا تھا، یہ دونوں اُس سے بادشاہت چھین سکتے تھے، دُوسرے لڑکا انسان معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر بادشاہ انسانوں سے ڈرتا بھی تھا اور نفرت بھی کرتا تھا۔ وہ غرّا کر بولا۔

”جاؤ جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ تم دونوں کو جان سے مار دوں گا۔“

کوراک کا دل اِس خیال سے بَلّیوں اُچھل رہا تھا کہ گوریلے انہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ بادشاہ گوریلے کی یہ کڑوی کسیلی بات سُن کر اُس کو آگ لگ گئی۔ بادشاہ گوریلا اُس کے عین نیچے کھڑا تھا۔ اِس سے پہلے کہ آکُوٹ اس کے ارادے کو تاڑ سکے، وہ کود کر گوریلے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور چلّایا۔ ”میں کوراک ہوں۔ میں تو تم لوگوں میں رہنے سہنے آیا ہوں اور تم مجھے بھگا رہے ہو۔ میں چلا جاتا ہوں مگر جانے سے پہلے تم کو مزہ چکھا دینا چاہتا ہوں۔“

آکُوٹ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے گھبرا کر چیخ چیخ کر کوراک کو واپس بلانا شروع کر دیا۔ اُسے معلوم تھا کہ دوسرے گوریلے اپنے بادشاہ کی مدد کو ضرور آئیں گے۔ کوراک کے لیے جان بچانا مشکل ہو جائے گا اور اگر وہ کوراک کی مدد کو پہنچے گا تو وہ بھی مارا جائے گا۔

بادشاہ گوریلا جب کوراک پر جا پڑنے کے لیے اُچھلا اُس وقت اس کے

اگلے پنجے شکار کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے ہوئے تھے اور جبڑے چرے ہوئے تھے تاکہ اپنے دانت اس کی کھال میں گڑو سکے۔ کوراک بھی اُس کے حملے کو روکنے کے لیے چھلانگ مار کر آگے بڑھا مگر دَبکا دَبکا۔

جب وہ گوریلے سے بِھڑا تو ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوم کر پوری طاقت سے گوریلے کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ یہ گھونسا اتنے زور کا تھا کہ بادشاہ گوریلے کی چیں بول گئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ باقی گوریلے غصّے سے دھاڑتے ہوئے کوراک پر چڑھ دوڑے۔ آکُوٹ بڑا سمجھ دار حیوان تھا۔ وہ اتنے سارے گوریلوں سے لڑنے کو تیّار نہ ہوا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کوراک واپس لوٹنے کی صلاح نہ مانے گا۔ اِدھر حالت اِتنی نازک تھی کہ اُسے سمجھاتے میں منٹ بھر کی دیر ہو جانے ہی سے اُن دونوں کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ اِس لیے آکُوٹ نے یہ ترکیب کی کہ کوراک کو کمر سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور دوڑ کر اُس درخت کا رُخ کیا جس کی شاخیں اکھاڑے پر جھکی پڑ رہی تھیں۔ گوریلوں کی بھیانک بھیڑ نے اُس کا پیچھا کیا مگر آکُوٹ ان سے زیادہ

تیز دوڑ کر، ایک شاخ کو پکڑ کر، کوراک سمیت، اوپر چڑھ گیا اور رات کے اندھیرے میں شاخوں شاخوں دوڑتا ہوا دُور نکل گیا۔ گوریلے کچھ دیر تک دوڑ بھاگ کرتے رہے، پھر ایک جگہ رُک کر کھڑے ہو گئے اور چیخیں مارنے لگے جن سے سارا جنگل لرز اٹھا۔ اِس کے بعد اُلٹے قدموں واپس چلے گئے۔

# بے چاری مریم

کوراک کو گوریلوں کی اس بد سلوکی پر بڑا رنج ہوا۔ اُسے جنگل کی زندگی سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اور آ کُوٹ دونوں ہی مُنہ لٹکائے چلے جا رہے تھے کہ انہیں اپنے سے سو گز آگے ایک باڑھ نظر آئی جس کے اُس طرف بہت سی جھونپڑیاں تھیں۔ کوراک کے دل میں انتقام کی آگ سُلگ رہی تھی۔ آ کُوٹ کو وہیں رُکے رہنے کا اشارہ کر کے وہ یہ معلوم کرنے کے لیے آگے بڑھا کہ یہ کیا بستی ہے۔ وہ درختوں درختوں چلا اور باڑھ کے اُس طرف سے جو آواز سنائی دی فوراً اُس کا رُخ کرنے لگا۔ جس جگہ سے آواز

آئی تھی اُس کے عین اوپر ایک بڑے سارے درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ کوراک ہاتھ میں نیزہ سنبھالے اُس میں گھُس کر شاخوں شاخوں رینگ کر آگے بڑھنے لگا۔ اُس کے کانوں نے بتایا تھا کہ آواز کسی انسان کی ہے۔

آگے چل کر اسے ایک انسانی پیٹھ نظر آئی۔ یہ ایک لڑکی کی پیٹھ تھی۔ جس کی کھال بھورے رنگ کی تھی۔ کوراک کا جی چاہا کہ وہ درخت سے اُتر کر اُس لڑکی کے پاس جا بیٹھے کیونکہ اس کا دل اپنے جیسے کسی انسان سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ مگر اُس نے آواز سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ جو بولی بول رہی ہے وہ اُسے نہیں آتی۔ پھر یہ ڈر بھی تھا کہ گاؤں والے ہتھیار لیے ہوئے نکل آئیں گے اور اُسے مار ڈالیں گے۔ ابھی وہ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ انسانوں اور اونٹوں کی ایک بھیڑ گاؤں کے دروازے سے اندر داخل ہونے لگی۔ اُس کا سردار ایک لمبا تڑنگا کالا آدمی تھا۔ اُس نے ایک کالی عورت سے کچھ پوچھا جس نے اُس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں لڑکی

کھیل رہی تھی۔ کوراک سمجھا کہ یہ آدمی اُس لڑکی کا باپ ہے مگر جب وہ آدمی لڑکی کے پاس آیا تو اُس نے بغیر کچھ کہے لڑکی کے لات ماری جس سے وہ زمین پر ِگر پڑی۔ کوراک فوراً نیچے کُود پڑا اور اُس آدمی کے مُنہ پر گھونسا مارا۔ وہ چکرا کر ِگر پڑا۔

لڑکی دہشت زدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور کوراک نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال دیا، جیسے اُس کی حفاظت کر رہا تھا۔

لڑکی نے کُچھ کہا مگر کوراک اُس کی بولی نہ سمجھا۔ لڑکی نے اشارے سے سمجھایا کہ یہ سردار ہے۔ جب ہوش میں آئے گا تو تمھیں مار ڈالے گا۔ کوراک اُسے ساتھ لے کر درخت کے تلے پہنچا اور اُسے گود میں بٹھا کر ایک ہی چھلانگ میں درخت پر چڑھ گیا۔ لڑکی نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال رکھے تھے۔ اُس کی گڑیا اُس کی کمر میں لٹک رہی تھی۔

وہ دونوں گاؤں سے تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ لڑکی کی نظر آ کُوٹ پر پڑ گئی۔ وہ چیخ مارتے مارتے رہ گئی اور کوراک سے اور مضبوطی سے چمٹ کر

گوریلے کی طرف اشارہ کیا۔ آ کُوٹ سمجھا تھا کہ کوراک شکار لایا ہے مگر جب اُس نے دانت نکالے، تو کوراک نے بھی دانت نکال لیے۔ آ کُوٹ خاموش ہو گیا۔ کوراک نے اُس سے کہا۔ ”یہ ہمارے ساتھ رہے گی اور اُسے کچھ نہیں کہنا ہے۔ اِس کی حفاظت کریں گے۔“

مگر بے چاری لڑکی کو، جس کا نام مریم تھا، آ کُوٹ سے ڈر لگ رہا تھا۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ حیوان اور اُس کی جان بچانے والا یہ نوجوان ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

کوراک اور آ کُوٹ جب خوراک کی تلاش میں نکلے تو اُسے بھی ساتھ لے گئے۔ مریم کی دہشت کے مارے جان نکلی جا رہی تھی۔ ایک جگہ وہ چیتل کا شکار کرنے لگے تو اسے ایک درخت کی شاخوں میں چھُپا گئے۔ ڈراؤنے جنگل میں اکیلے رہ جانا ہی کچھ کم جان لیوا نہ تھا مگر جب اُس نے ایک انسان اور حیوان کو ایک ساتھ شکار پر گرتے اور اُس کی کھال میں دانت گڑوتے دیکھا تو خوف کی وجہ سے اُس کی جان آدھی ہو گئی۔

جب کوراک واپس آیا تو اُس کا چہرہ اور ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ گرم گرم کچّے گوشت کا ایک بڑا سا لوتھڑا مریم کی طرف بڑھانے لگا۔ مریم گھبرا کر پرے ہٹ گئی۔ کوراک کو اُس کے انکار سے بڑی پریشانی ہوئی۔ وہ فوراً مُڑ کر جنگل میں گیا اور اُس کے لیے پھل لے کر آیا۔

مریم کو رات کے وقت سُلانے کا معاملہ بھی بڑا ٹیڑھا تھا۔ اسے زمیں پر سُلانے میں یہ خطرہ تھا کہ حیوان پھاڑ کھائیں گے۔ درخت پر سے گِر پڑتی۔ ایک یہی صورت تھی کہ وہ اُسے رات بھر گود میں لیے رہے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ وہ اِس طرح سوئی کہ ایک طرف آکُوٹ تھا، دوسری طرف کوراک۔

مریم کی آنکھ کھلی تو دِن کافی چڑھ چکا تھا۔ اس کا سر کوراک کے کندھے پر لڑھک گیا تھا اس لیے جب آنکھ کھُلی تو گوریلے کی جھَبری پیٹھ پر نظر پڑی۔ وہ ڈر کر پرے کھسکنے کو ہوئی تو معلوم ہوا کہ کوئی اُسے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔ سر گھُما کر دیکھا تو کوراک نظر آیا۔

کوراک نے اس سے گوریلوں کی زبان میں بات کی۔ اُس نے سر ہلا کر بتایا کہ یہ زبان نہیں جانتی۔ پھر اپنی بولی میں کچھ کہا۔ یہ زبان کوراک کو نہ آتی تھی۔

آکُوٹ بھی جاگ گیا تھا۔ کوراک نے جو کُچھ کہا وہ تو اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا مگر لڑکی کی چُوں چاں اُس کے لیے بے معنی تھی۔ وہ سر کھجاتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے جسم کو ہلانے جُلانے لگا۔ اُس کی اِس حرکت سے مریم چونکی اور وہ اس سے پرے سِرکنے لگی۔ گوریلے نے جب یہ دیکھا کہ لڑکی ڈر رہی ہے تو لطف لینے کے لیے اپنا بڑا سا پنجہ اُس طرح اس کی طرف بڑھانے لگا جیسے اُسے پکڑنا چاہ رہا ہے۔ مریم اور پرے سِرکنے لگی۔

آکُوٹ اُس سے لُطف لینے میں لگا ہوا تھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ کوراک آنکھیں سکیڑے اُسے گھُور رہا ہے۔ گوریلے کی انگلیاں لڑکی کے بازو پکڑنے کو تھیں کہ لڑکا غرّاتا ہوا اُٹھا اور اُس نے آکُوٹ کی تھوتھنی پر گھونسا مارا۔ آکُوٹ کو اِس اچانک حملے کا سان مان بھی نہ تھا۔ وہ چکرا کر

درخت سے نیچے گِر گیا۔

کوراک کھڑا ہو کر اس پر دیدے نکال ہی رہا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں میں سے اچانک سرسراہٹ سنائی دی۔ آکُوٹ زمین سے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ اِتنے میں ایک چیتا چھلانگ مار کر اُس پر آپڑا۔

مریم کا خوف کے مارے اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، اِس لیے نہیں کہ چیتا گوریلے پر آپڑا تھا بلکہ اِس لیے کہ عین اسی وقت کوراک اتنی بلندی سے کُود کر چیتے پر جا سوار ہوا تھا۔

چیتا کوراک کے اِس طرح ٹوٹ پڑنے سے گھبرا گیا۔ اور آکُوٹ اُس کے ناخنوں سے بال بال بچ گیا۔ وہ چیتے سے بچنے کے لیے لپک کر درخت پر چڑھ گیا مگر کوراک کو خطرے میں دیکھ کر پھر زمین پر پہنچ گیا۔ اب کوراک اور آکُوٹ دونوں چیتے کو لپٹے ہوئے تھے اور تینوں اِدھر اُدھر لڑھکتے پھِر رہے تھے۔ آخر لڑکے کے چاقو نے لڑائی کا فیصلہ کر دیا۔ چیتا بے جان ہو کر گِر پڑا۔ گوریلا اور لڑکا دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے

سامنے تن گئے۔ کوراک نے سر سے مریم کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ”تمھیں اِس سے کوئی واسطہ نہیں۔“ آ کُوٹ نے گلے سے ایسی آواز نکالی جیسے کہتا ہے۔ ”میں سمجھ گیا۔“ پھر چیتے کے بے جان جسم پر تن کر کھڑا ہو گیا اور ایک خوفناک دھاڑ ماری، جس سے مریم تھَر تھَر کانپتی ہوئی ڈھے گئی۔

مہینوں پر مہینے اسی طرح گزرتے چلے گئے۔ شروع میں مریم ڈری، پھر اُس کا بھی ڈر نکل گیا۔ اُس نے گوریلوں کی زبان سیکھ لی اور شکار میں اُن کے ساتھ شریک ہونے لگی۔

کوراک نے ایک دیو جیسے درخت کی شاخوں میں ایک چھوٹا سا مچان بنا دیا تھا۔ رات کو مریم اُس میں سوتی۔ گوریلا اور لڑکا اُس کے قریب بیٹھے اُس کی حفاظت کرتے۔ روز یہی ہوتا کہ خوراک تلاش کی، پیٹ بھرے اور پڑ کر سو گئے۔ کوراک نے اب انسانوں کی دنیا میں واپسی جانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ اُسے مریم جیسی ساتھی مِل گئی تھی۔

اِدھر مریم بھی اُس سے خوب ہِل گئی تھی۔ اور وہ بھی جنگل ہی کو اپنا گھر سمجھنے لگی تھی۔ اُس کی گڑیا کے کپڑے اب چیتے کی کھال کے تھے اور اُس کے بالوں میں جنگلی طوطے کے پَر لگے ہوئے تھے۔

ایک دِن جب آ کُوٹ اور کوراک شکار کرنے گئے ہوئے تھے، ایک بندر نے مریم کے پاس پہنچ کر کہا۔

"جلدی سے درخت پر چڑھ جاؤ۔ گوریلے آرہے ہیں۔"

مریم جنگلی جانوروں کی بولی سمجھنے لگی تھی۔ اُس نے کہا۔ "اِس جنگل میں تو دو ہی گوریلے ہیں۔ ایک کوراک اور دوسرا آ کُوٹ وہی آرہے ہوں گے۔ پھر اُوپر چڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

مگر بندر اِسی طرح چیختا رہا اور پھر درخت کی پھُننگ پر جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد درختوں میں سے ایسی آوازیں آئیں جیسے دو گوریلے آرہے ہیں۔ مریم سمجھی کوراک اور آ کُوٹ ہیں۔ وہ کوراک سے ہنسی کرنے کے خیال سے سوتی بن گئی۔ پھر اُسے ایسی آہٹ ہوئی جیسے آنے والے رُک کر کھڑے

ہو گئے ہیں۔ مریم نے دِل میں سوال کیا۔ ”یہ چُپ کیوں ہے۔ کوراک نے روز کی طرح سلام کیوں نہیں کیا؟“

پھر کوئی دبے پاؤں اُس کی طرف بڑھا۔ ”کیا کوراک کوئی مذاق کر رہا ہے؟“ اُس نے آنکھیں کھولیں تو ایک بڑا سا گوریلا اُس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اُس کے پیچھے ایک اور گوریلا بھی تھا۔

مریم گلہری کی سی پھُرتی سے کھڑی ہو گئی۔ عین اُسی لمحے گوریلا اُس پر جھپٹا مگر مریم شاخوں شاخوں بھاگنے لگی۔ اِدھر دونوں گوریلے بھی اُس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ اور اُوپر چڑھتی گئی تاکہ گوریلے پتلی شاخوں پر چڑھیں تو بھاری ہونے کی وجہ سے گِر پڑیں۔ مگر گوریلے بھی اُس کا پیچھا کرتے ہی چلے گئے۔ بار بار اُن کے پنجوں کی انگلیاں اُس پر پڑنے کو ہوتیں مگر وہ اُن سے بچ جاتی۔ وہ سہج سہج بُلندی پر پہنچتی جا رہی تھی کہ اچانک وہ شاخ، جسے اُس نے پکڑا، ٹوٹ گئی اور وہ دھم سے نیچے گِر پڑی۔ گوریلوں نے اُسے آن لیا مگر اُن میں آپس میں جنگ ہونے لگی۔ ہر ایک کہتا تھا کہ یہ شکار میرا

ہے۔

آخر بڑے گوریلے نے چھوٹے کو مار ڈالا۔ پھر مریم کے پاس آکر اس کے بے ہوش جسم کو سونگھا۔ بندروں کے غول کے غول اپنے دوست کو راک کی دوست کے ہاتھ ہمدردی کی وجہ سے آگئے اور درختوں پر بیٹھے بیٹھے گوریلے کو ڈانٹنے لگے۔ گوریلے نے دانت نکال کر اُن کو گھورا پھر جھک کر لڑکی کو اُٹھا کر کندھے پر ڈالا اور جنگل میں غائب ہو گیا۔

# دُشمن کا خاتمہ

کوراک شکار مار کر واپس آیا تو اُس نے بندروں کو گھبرا گھبرا کر آوازیں نکالتے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ضرور کُچھ گڑبڑ ہے۔ شاید سانپ نے کسی بندر کو اپنی کنڈلیوں میں جکڑ لیا ہے۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ بندر مریم کے دوست تھے۔ اُن کی مدد کرنا فرض تھا۔ اُس نے شکار مریم کے مچان والے درخت پر رکھا۔ اور اُسے آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے دل میں سوچا، چھُپ گئی ہے۔ پھر اُس نے

اُس شاخ کی طرف نظر اُٹھائی جس پر وہ جھولا جھولتی تھی۔ وہاں صرف اس کی گڑیا درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ ایک بار پھر آواز دی۔ اب کے بھی جواب میں کوئی نہ بولا۔

بندروں کے شور مچانے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ کوراک جلدی سے بندروں کی جانب چلا۔ اُسے دیکھتے ہی انہوں نے شور مچا مچا کر آگے کی جانب اشارہ کیا۔ کوراک نے دیکھا کہ ایک بڑا سا گوریلا مریم کے بے جان جسم کو اپنے جھبرے کندھوں پر ڈال کر لے جا رہا ہے۔ وہ آہٹ سن کر مُڑا تو کوراک نے دیکھا کہ یہ وہی بادشاہ گوریلا ہے جس نے اُسے اپنے قبیلے میں رہنے سہنے نہیں دیا تھا۔ اُدھر گوریلے نے بھی کوراک کو پہچان لیا اور ایک دم اُس پر چڑھ دوڑا۔ دونوں کی ٹکّر ہوئی اور وہ ایک دوسرے کو مارتے اور نوچتے ہوئے زمین پر ِگر پڑے۔ اتنے میں مریم ہوش میں آ گئی۔ وہ زور سے چیخی۔ "کوراک، مُجھے معلوم تھا تم آؤ گے۔ اِسے مار دو، کوراک، مار دو۔" اور پھر جلدی سے اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی تا کہ اس کی ہمّت

بندھائے۔

قریب ہی کوراک کا نیزہ پڑا تھا۔ مریم نے فوراً اُٹھا لیا۔ اور اُس کی نوک گوریلے کے سینے میں گھُسیڑ دی۔ مگر گوریلا پہلے ہی مر چکا تھا۔ کوراک نے اپنے فولادی ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ پھر بھی اُس نے مریم کا شکریہ ادا کیا اور اُس کی پیٹھ ٹھونکی۔

اچانک آکُوٹ نے آکر اُنہیں خطرے سے خبردار کیا۔ جنگل کی طرف سے آہٹ ہو رہی تھی۔ پھر ایک گوریلا جھاڑیوں میں سے نکل کر سامنے آیا۔ اُس کے پیچھے اور گوریلے بھی تھے۔ اُن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔ یہ اس بادشاہ گوریلا کا قبیلہ تھا جسے کوراک نے ہلاک کیا تھا۔

آکُوٹ نے بادشاہ گوریلے کے مردہ جسم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”کوراک نے تمہارے بادشاہ کو مار ڈالا ہے۔ یہ ٹارزن کا بیٹا ہے۔ پورے جنگل میں اِس سے بڑا بہادر اور کوئی نہیں ہے۔ اب یہ بادشاہ ہے۔ کوئی گوریلا ہے جو اِس کے مُقابلے میں آسکے؟“

گوریلے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر ایک نوجوان گوریلا آہستہ آہستہ چل کر آگے آیا۔ اُس کے بال کھڑے ہوئے تھے، مُنہ سے غرّاہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور صورت شکل سے بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔

کوراک اُس سے لڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ بھی غرّا رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ یہ گوریلا طاقتور بھی ہے اور تازہ دم بھی۔ میں ابھی ابھی ایک گوریلے سے لڑ چکا ہوں، اس لیے زور آزمائی کرنے کی جگہ چال چلنی چاہیے۔ اُسے فوراً ہی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ گوریلا جبڑے پھاڑے کوراک پر تیری سے جھپٹا۔ کوراک بے حرکت کھڑا رہا۔ لیکن جب گوریلے نے اُسے جکڑنے کے لیے بازو پھیلائے تو کوراک نے اُس کے دائیں جبڑے پر اتنے زور کا گھونسا مارا کہ وہ زمین پر چاروں شانے چِت گر پڑا۔

گوریلے کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اُس نے اُٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اُس کے بھیانک ہونٹوں پر جھاگ پھیلی ہوئی تھی، چھوٹی

چھوٹی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور سینے کے اندر سے گڑ گڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی مگر کوراک نے اُسے اُٹھنے نہ دیا۔ اُس نے ایک اور گھونسا ایسا مارا کہ گوریلا چاروں شانے چِت گرا۔ اُس نے بار بار اُٹھنے کی کوشش کی مگر ہر بار کوراک نے گھُونسا مار کر گِرا دیا۔ گوریلے کا منہ لہولہان ہو گیا۔ اُس کی ناک اور منہ سے خون کی تُلّلی بندھ گئی۔ گوریلوں کی جو بھیڑ پہلے نعرے لگا لگا کر اُس کی ہمّت بڑھا رہی تھی، اب اُس کی ہنسی اڑانے لگی۔ وہ کوراک کو داد دے رہے تھے اور اُس کے ہر گھونسے پر خوشی کے نعرے لگاتے تھے۔

"کا گوڈا؟" کوراک نے گوریلے کو گِراتے ہوئے پوچھا۔ مگر گوریلے نے جواب دینے کے بجائے اُٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ کوراک نے اُس کے ایک اور گھونسا لِگایا اور ایک بار پھر پوچھا۔ "کا گوڈا؟"

ایک لمحے تک گوریلا بے حرکت پڑا رہا۔ پھر اُس کے سُوجے ہوئے ہونٹوں سے نکلا۔ "کا گوڈا۔"

کوراک بولا۔ "پھر اُٹھ اور اپنے قبیلے میں جا۔ میں اِن گوریلوں کا بادشاہ بننا

پسند نہیں کرتا جنہوں نے مُجھے اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جب ہم ملیں گے تو دوستوں کی طرح ملیں گے۔"

ایک بوڑھا گوریلا آہستہ آہستہ چل کر کوراک کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "تم نے اس گوریلے کو ہرا دیا ہے۔ یہ ہمارا بادشاہ بنتا۔ اگر تُم چاہتے تو اُسے مار بھی ڈالتے۔ اب وہ ہمارا بادشاہ نہیں بن سکتا۔ بتاؤ، ہم کِسے بادشاہ بنائیں؟" کوراک نے آکُوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اِسے بناؤ۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا مگر تم سے دُور بھی نہیں رہوں گا۔ جب تُم شکار کی جگہ بدلو گے تو میں بھی اپنی جگہ بدل دیا کروں گا۔"

آکُوٹ کو کوراک کی تجویز بالکل پسند نہ آئی۔ وہ کسی طرح بھی اپنے دوست ٹارزن کے بیٹے سے الگ نہ ہونا چاہتا تھا۔ اُسے ٹارزن سے محبّت تھی۔ مدّتوں سے اُس کے ساتھ رہا تھا۔

بے شمار موقعوں پر اکھٹّے خطرے جھیلے اور خوفناک دُشمنوں پر ایک دوسرے کی مدد سے فتح پائی تھی۔ ٹارزن کی یاد اُس کے دِل سے کس طرح

نکل سکتی تھی۔ جیک، جس کا نام اُس نے کوراک رکھا تھا، اُسی ٹارزن کی نشانی تھا۔ وہ اُسے کیسے چھوڑ دیتا۔ اُس نے گوریلوں کے ساتھ جانے سے اِنکار کر دیا۔ مگر جب کوراک نے بہت زور دیا تو مجبوراً گوریلوں کے ساتھ ہو لیا۔

# مریم کہاں گئی

جب کوراک، گوریلے سے لڑ رہا تھا تو لڑائی کی آوازیں گاؤں کے باشندوں کے کانوں میں پڑیں جہاں سے کوراک کبھی کبھی کھانے کی چیزیں اور ہتھیار اُٹھالایا کرتا تھا۔ پہلے تو انہیں پتہ ہی نہ چلا تھا یہ شرارتیں کون کرتا ہے۔ پھر اتّفاق سے ایک دِن معلوم ہو گیا کہ یہ کام سفید گوریلے کا ہے۔ گاؤں کا سردار کوڈو اور اُس کے آدمی اُس فکر میں رہنے لگے کہ اگر سفید گوریلا کہیں مل جائے تو اُسے جان سے مار دیں۔

جب وہ لڑائی کی آوازیں سُن کر تماشہ دیکھنے آئے تو معلوم ہوا کہ وہی سفید گوریلا لڑ رہا ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔

وہ ایک جگہ چھُپ کر دیکھنے لگے کہ اِس لڑائی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ سفید گوریلا جیت گیا۔ پھر اور گوریلے آئے۔ اُن کے اور آ کُوٹ کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ بھی انہوں نے سُنی۔ اِس دوران میں اُن کی نظریں چھدرے بدن کی اُس لڑکی پر جمی رہیں جو گوریلوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ حیران تھے کہ یہ یہاں کیسے پہنچی۔

جب گوریلوں کا قبیلہ وہاں سے چلا گیا اور آ کُوٹ گوریلوں کے پیچھے روانہ ہو گیا تو کوڈو کا ایک آدمی اُس سے کہنے لگا۔ ”جب میں اور میرا بھائی ایک گاؤں میں غلام تھے تو اس وقت میرے بھائی نے گاؤں کے سردار کی بیٹی کے لیے یہ گڑیا بنا کر دی تھی جو اِس لڑکی کے ہاتھ میں ہے۔ جب ہم دونوں بھائی اِس گاؤں سے بھاگے تھے اُس سے ذرا پہلے کوئی شخص سردار کو مار پیٹ کر اِس لڑکی کو چُرا لے گیا تھا۔ اگر یہ وہی لڑکی ہے تو اِسے چھین لینا

چاہیے۔ سردار بڑا بھاری انعام دے گا۔“

کوڈو نے اپنے آدمیوں کو سفید گوریلے پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اُنہوں نے اُس پر تیر پھینکنے شروع کر دیے۔ ایک تیر سے کوراک کا کندھا چھد گیا۔ دوسرے سے ٹانگ زخمی ہو گئی۔ تیسرا تیر لگا تو وہ زمین پر گر پڑا۔

اچانک جنگل میں سے بھاری بھرکم آ کُوٹ اور اُس کے پیچھے پیچھے پہاڑ جیسے گوریلے نمودار ہوئے اور جنگلیوں پر پِل پڑے۔ کوڈو نے دیکھا کہ اِن بلاؤں سے لڑنا موت کے منہ میں جانا ہے تو اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مریم کو اُٹھا کر پیچھے ہٹ آؤ۔ اُس کے آدمیوں نے ایسا ہی کیا۔

جب آ کُوٹ کوراک کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ بے ہوش پڑا ہے اور اُس کے زخموں سے خون بہہ رہا ہے۔ اُس نے کوراک کے جسم میں گھُسے ہوئے تیر نکالے، زخموں کو چاٹا اور پھر اُسے اُٹھا کر اس مچان پر لے گیا جو کوراک نے مریم کے لیے بنایا تھا۔ وہ اُس سے زیادہ اور کُچھ نہ کر سکتا تھا۔ باقی کام قدرت کو کرنا تھا۔

کوراک کئی دِن تک بخار میں جلتا رہا۔ آ کُوٹ اور گوریلے اُس کے قریب ہی رہے، تاکہ اُسے سانپوں اور درندوں سے بچائے رکھیں۔ آ کُوٹ نے اُسے پہلے رسیلے پھل لا لا کر دیے تاکہ اُس کی پیاس بجھے اور بخار اُترے۔ کوراک کا جسم بہت طاقتور تھا، وہ تیروں کے زخموں کی تکلیف جھیل گیا۔ زخم اچھّے ہو گئے، اُس کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو گئی۔

کوراک کو اپنے زخموں کی وجہ سے تو تکلیف تھی ہی، مگر اس سے زیادہ یہ تکلیف تھی کہ خبر نہیں مریم پر کیا گزری؟ وہ زندہ بھی ہے یا وحشی اُسے کھا گئے۔ لمبے لمبے دِن جوں تُوں گُزرتے رہے مگر آخر کار کوراک میں اتنی طاقت آ گئی کہ وہ رینگ کر باہر نکلنے اور بے سہارے زمین تک پہنچنے کے قابل ہو گیا۔ اب وہ گوشت بھی کھانے لگا تھا جو آ کُوٹ لا لا کر دیتا تھا۔ گوشت کھانے سے اُس کی طاقت تیزی سے بڑھی اور اب اُس نے فیصلہ کیا کہ اُسے کوڈو کے گاؤں پہنچنا چاہیے۔

جانسن اور مالبن جو کئی برس پہلے کوراک اور آ کُوٹ سے ڈر کر بھاگ گئے

تھے، اُس سال ایک چڑیا گھر کے لیے گوریلے پکڑنے آئے ہوئے تھے۔
انہوں نے جو پھندا لگایا اس میں آ کُوٹ پھنس گیا۔ اتّفاق سے کوراک اُدھر
جانکلا تو یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ جب جانسن اور مالبن پھندے کی جگہ
پر پہنچے تو کوراک نے، جو اب ایک کڑیل جوان تھا اُنہیں پہچان لیا۔ اِدھر
بیسیوں گوریلے پھندے کے تاروں کو جھٹکے دے رہے تھے اور پوری قوّت
سے چلّا رہے تھے۔ جانسن اور مالبن نے اُنہیں فائر کر کے بھگا دیا اور
پھندے کی طرف بڑھنے لگے۔

کوراک نے گوریلوں سے کہا۔ "یہ دونوں آدمی میرے بھی دُشمن ہیں اور
تمہارے بھی۔ میں تمہارے بادشاہ کو پھندے سے چھُڑانے میں تمہاری
مدد کروں گا۔ جب میں اِن دونوں آدمیوں پر حملہ کروں تو تم بھی اِن پر
چڑھ دوڑنا۔ ہم مِل کر اُن کو بھگا دیں گے اور بادشاہ کو چھُڑا لیں گے۔"

سب گوریلوں نے ایک آواز سے کہا۔ "جو تم نے بتایا ہے، ہم وہی کریں
گے۔"

کوراک درخت سے کود کر جانسن اور مالبن کی طرف لپکا۔ فوراً ہی گوریلے بھی اُن پر ٹوٹ پڑے۔ جانسن اور مالبن نے کوراک پر فائر کیے۔ مگر گھبراہٹ میں گولیاں نشانے پر نہ لگیں۔ گوریلوں نے اُن کو جالیا۔ وہ بڑی مُشکل سے جانیں بچا کر بھاگے۔ سو گز آگے ان کے آدمی اُن سے آن ملے ورنہ گوریلوں نے اُن کے چیتھڑے اُڑا دیے ہوتے۔ آکُوٹ آزاد ہو گیا اور اب کوراک کوڈو کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں ہاتھیوں کی ایک ڈار ملی۔ ہاتھی کوراک کی بُو سُونگھنے کے بعد بھاگنے کی تیّاریاں کرنے لگے۔ مگر کوراک نے ایک بوڑھے ہاتھی کو جب یہ بتایا کہ وہ کون ہے تو وہ رُک کر کھڑے ہو گئے اور بڑے دوستانہ انداز سے پیش آئے۔

کوراک جب کوڈو کے گاؤں میں گھُسا، اُس وقت رات ہو چکی تھی۔ اُس نے کانوں، آنکھوں اور ناک سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مریم کس جھونپڑی میں ہے۔ گاؤں کی سڑک کے سِرے پر ایک جھونپڑی میں

سے مریم کی بُو آئی مگر جب وہ جھونپڑی کا چکّر کاٹ کر اُس کے دروازے پر آیا تو وہاں ایک بھاری بھر کم کالا سا آدمی ایک لمبا سا نیزہ لیے پہرا دے رہا تھا۔

کوراک کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ سڑک پر آگے جا کر جِن چولھوں پر ہنڈیاں چڑھی ہوئی تھیں اُن کی آگ کی چمک میں وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جھونپڑی کے اندر داخل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ کوراک یا تو پہرے دار کا گلا گھونٹ دے یا اس کی نظر بچا کر اندر گُھسے۔

پہرے دار کی پیٹھ اور دروازے کے چوکھٹے میں بارہ اِنچ کا فاصلہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ کوراک اس وحشی کے پیچھے سے اس طرح گزر سکتا ہے کہ اسے پتہ نہ چلے؟ جو روشنی پہرے دار کی کالی کالی پیٹھ پر پڑ رہی تھی وہی کوراک پر بھی پڑ رہی تھی۔ اگر ان کالے انسانوں میں سے کسی نے اس طرف دیکھا جو بازار میں آگے چولھوں کے پاس بیٹھے ہیں تو وہ اسے ضرور تاڑ لیں گے۔

کوراک جھونپڑی کی دیوار سے لگے لگے پہرے دار کے قریب ہوتا گیا۔ پھر وہ اس کے کندھے کے قریب پہنچ گیا اور اس کے بعد اس کی پیٹھ کے پیچھے سے گزرنے لگا۔ اس کے کانوں میں پہرے دار کی سانس کی آواز آ رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ اس بھونڈو کو ابھی تک خطرے کا احساس نہیں ہوا۔ پہرے دار اس طرح بے خبر بیٹھا تھا جیسے اسے کوراک کی موجودگی کا کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔

کوراک ایک دفعہ میں صرف انچ بھر آگے بڑھتا پھر ایک لمحے کے لیے بے حرکت کھڑا ہو جاتا۔ وہ اسی طرح پہرے دار کی پیٹھ کے پیچھے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پہرے دار نے جمائی لی۔ پہلے بھاڑ سا منہ کھولا۔ پھر دونوں ہاتھ سر کے اوپر لے گیا۔ کوراک پتھّر کی طرح بے حرکت کھڑا رہا۔ بس ایک قدم کی کسر تھی۔ جھونپڑی کا دروازہ آ گیا تھا۔

پہرے دار نے اپنے بازو نیچے کر لیے اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے عین پیچھے دروازے کا چوکھٹا تھا۔ اس نے ذرا اونگھ لینے کے لیے کمر اس سے لگائی

چاہی۔ مگر اس کا سر اور کندھے دروازے کے چوکھٹے کی جگہ کوراک کی ٹانگوں سے جا بھڑے۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے تعجّب کی آواز نکلے، کوراک کی انگلیاں اس کا گلا دبانے لگیں۔

پہرے دار نے اٹھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور کوراک کی پکڑ سے چھوٹنے کی کوشش کی مگر وہ ہل بھی نہ سکا۔ اُس کے گلے پر جو انگلیاں رکھی ہوئی تھیں، اُن کا دباؤ ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

کوراک نے جھونپڑی کے اندر گھُس کر بہت آہستہ سے کہا۔ "مریم۔"

جواب میں مریم نے فوراً کہا۔ "کوراک۔"

کوراک نے جھک کر وہ بندھن کاٹ دیے جن سے مریم کے ٹخنے اور کلائیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پھر اُس نے مریم کو اُٹھا کر کھڑا کیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے چلا۔ باہر ایک کتّا پہرے دار کے پاؤں سونگھ رہا تھا۔ وہ اُن دونوں کو جھونپڑی سے باہر نکلتے دیکھ کر غرّایا اور پھر

بھونکنا شروع کر دیا۔ جو آدمی آگ کے پاس بیٹھے تھے اُن کو شُبہ گزرا۔ انہوں نے سر گھُما کر اس طرف دیکھا۔

کوراک فوراً جھونپڑی کی دیوار کے سائے میں ہو گیا اور مریم کو بھی وہی کھینچ لیا۔ مگر حبشیوں نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ اُن میں سے ایک درجن آدمی دوڑ کر اُدھر آرہے تھے۔ بھونکتا ہوا کتّا ابھی تک کوراک کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اُن آدمیوں کو بھاگنے والوں کا پتہ نشان بتا رہا تھا۔

ان آدمیوں کے دوڑنے اور چلّانے سے اُن کے اور ساتھی بھی خبردار ہو گئے۔ انہوں نے بھی چلّانا شروع کر دیا۔ یہ شور سُن کر گاؤں کی ساری آبادی اُن کی مدد کو آ گئی۔ سب سے پہلے انہیں پہرے دار کی لاش نظر آئی۔ اُن میں سے ایک حوصلہ کر کے جھونپڑی کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ قیدی لڑکی غائب ہے۔ جھونپڑی میں یا اُس کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ اِس لیے وہ بھونکتے ہوئے کتّے کی طرف لپکے۔ اِس کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک سفید انسان لڑکی کو اُٹھائے بھاگا جا رہا ہے۔ اُسے مار لینا کون

سی بڑی بات تھی۔ انہوں نے اس پر ہلّا بول دیا۔

کوراک نے دُشمنوں کو دیکھتے ہی مریم کو کندھے پر ڈالا اور ایک درخت کی طرف لپکا تاکہ اس پر چڑھ کر گاؤں سے نکل بھاگے۔ مگر انیس بیس حبشیوں نے اسے راستے ہی میں آلیا اور ٹانگوں پر چوٹیں مار کر اُسے زمین پر گرادیا۔ مگر کوراک جوں توں پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ حملہ آوروں کی مدد کے لیے اور بھی بہت سے لوگ آن پہنچے تھے مگر کوراک نے اکیلے ہی اُن سب کی خبر لینی شروع کر دی۔ جو سامنے آیا اُس کا منہ بجا دیا۔ ایک دیو جیسے حبشی نے کوراک پر اپنا مُوٹھ دار ڈنڈا مارنا چاہا۔ کوراک نے یہ ڈنڈا اُس سے چھین لیا اور حبشیوں کا بزن بول دیا۔ جس نے مُقابلہ کیا اُسے مار گرایا۔ صاف نظر آنے لگا کہ وہ سارے گاؤں کو بھگا کر مریم سمیت صاف نکل جائے گا۔

بڈھا کوڈو تاڑ گیا کہ کوراک اس کے بس کا نہیں ہے۔ اُس نے اپنے قبیلے والوں کو حکم دیا کہ مریم کے گرد، جسے انہوں نے کوراک سے چھین لیا تھا،

گھیر اڈال کر کھڑے ہو جائیں اور کوراک کے حملے روکتے رہیں۔

کوراک اُن پر بار بار جھپٹا مگر ہر بار پیچھے دھکیل دیا گیا۔ نیزے کی باڑ سے ٹکرا ٹکرا کر وہ سر سے پاؤں تک لہولہان ہو گیا تھا۔ آخر وہ سمجھ گیا کہ میں اکیلا مریم کو نہیں چھڑا سکتا۔ اس نے چلّا کر مریم سے کہا۔ ”اس وقت میں جا رہا ہوں مگر بہت جلد تمہیں چھُڑانے کے لئے واپس آؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔“

پھر وہ اچھل کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ دُشمن نے اس پر نیزے برسائے مگر وہ چھلاوے کی طرح جنگل کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

# اجنبی شکاری

کوڈو نے اُس سردار کے گاؤں کی طرف اپنا ایک آدمی دوڑا دیا، جس سے
لڑکی کے بدلے مال ملنے کی اُمّید تھی۔ مگر اُس آدمی کی راستے میں جانسن
اور مالبن سے مُڈ بھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے اُس سے یہ معلوم کر لیا کہ کہاں جا
رہا ہے اور کس لیے جا رہا ہے۔ پھر اُسے گولی مار کر ختم کر دیا اور مریم کو
چھیننے کے لیے کوڈو کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ انہیں گاؤں میں ایک سفید لڑکی

کی موجودگی کا علم ہے۔

اِدھر کوڈو نے یہ سوچا کہ پتہ نہیں وہ سردار اِس لڑکی کے بدلے کتنا مال دیتا ہے اور معلوم نہیں دیتا بھی ہے یا نہیں۔ کیوں نہ میں لڑکی کو اُن لوگوں کے ہاتھ بیچ دوں۔ یہ مجھے بہت سا مال دیں گے۔

وہ بولا۔ ”ایک جگہ تمہاری قوم کی لڑکی ہے۔ اگر تم خریدنی چاہو تو سستی مل جائے گی۔“

مالبن نے کندھے جھٹک کر کہا۔ ”پہلے ہی کافی مصیبتیں ہیں۔ ایک مصیبت اور لا دلیں۔ نابابانا۔“

کوڈو بولا۔ ”وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔“

مالبن ہنسا۔ ”تم کو اپنے پرانے دوستوں سے مذاق کرتے شرم نہیں آتی؟“

کوڈو فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”آؤ دکھا دوں۔ پھر تو مان لوگے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

کوڈو اُنہیں ساتھ لے کر اپنی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک لڑکی، ہاتھ پاؤں بندھی، چٹائی پر پڑی تھی۔ مالبن نے اُس کی طرف ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیا اور کہا۔ ”یہ تو بڑھیا ہے۔“

”واہ“ کوڈو بولا۔ ”بڑھیا کیوں ہونے لگی۔ تم اندھیرے میں اِسے ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکے ہو۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ باہر بُلواتا ہوں۔ روشنی میں دیکھو۔“

جب مریم باہر لائی گئی تو وہ اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اب وہ سولہ سترہ سال کی تھی اور اتنی خوبصورت تھی کے مالبن کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

”کیوں؟“ کوڈو نے پوچھا۔ ”اب بتاؤ، کیا کہتے ہو؟“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ مالبن نے جواب دیا۔ ”مگر پھر بھی بوجھ ہی بنے گی۔ ہم نہیں خریدتے۔“

مریم خاموش کھڑی اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ مالبن نے اُس سے جنگلیوں

کی زبان میں پوچھا۔ ”ہم تمہیں یہاں سے نکال لے چلیں؟“

مریم نے جواب دیا۔ ”میں کوراک کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“

”تم ہمارے ساتھ چلو گی۔“ مالبن نے کہا۔ اور پھر کوڈو سے بولا۔ ”بولو، کیا لو گے؟“

کوڈو نے بھاؤ تاؤ شروع کر دیا۔ آخر چھ گز کپڑا، تین خالی بوتلوں اور ایک چاقو پر سودا ہو گیا۔ ان کو کوڈو نے یہ پتے کی بات بھی بتا دی کہ ایک سفید گوریلا اسے چھڑانے کی کوشش کر تا رہا ہے۔ اس لیے انہیں چاہئے کہ کل صُبح ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

مریم تمام رات کوراک کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ اُسے جنگل کی اور سب آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ مگر کوراک کی آہٹ کبھی نہ ہوئی۔ پھر بھی اسے یقین تھا کہ کوراک آئے گا اور ضرور آئے گا۔ لیکن کوراک نہیں آیا اور اگلی صُبح کو اُس کے سفید دُشمنوں نے وہاں سے کُوچ کر دیا۔

جب چار دِن کے بعد بھی کوراک اُسے چھڑانے نہ آیا تو مریم کی آس ٹوٹنے لگی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ کوراک کو ضرور کچھ ہو گیا ہے۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔

چوتھے دِن وہ ایک جگہ رُکے اور اپنا خیمہ لگایا۔ کھانے کے بعد جانسن اور مالبن میں جھگڑا ہونے لگا۔ جانسن کہتا تھا کہ لڑکی کو اُس کے ماں باپ کے پاس پہنچا کر انعام حاصل کرنا چاہیے، مگر مالبن کی خواہش تھی کہ وہ اسے اپنی بیوی بنائے۔ جانسن یہ بات ماننے کو تیّار نہ ہوا۔ مالبن نے غصّے میں آکر اُسے گولی سے اُڑا دیا۔ مریم نے ڈر کر چیخ ماری۔

اس کی یہ چیخ اُس شکاری نے سُنی جو اس وقت وہاں سے چند گز پرے کھڑا تھا۔ وہ گوری چمڑی کا یورپی تھا اور یہ معلوم کرنے اِدھر آرہا تھا کہ یہ کس کا کیمپ ہے۔

شکاری بہت لمبا تڑنگا اور بھاری بھر کم آدمی تھا۔ وہ تیزی سے چل کر قریب پہنچا اور جب خیمے کے اندر گھُسا تو دیکھا کہ ایک آدمی مرا پڑا ہے، ایک

لڑکی ایک کھونٹے سے بندھی ہوئی ہے اور ایک لمبا تڑنگا آدمی ہاتھ میں پستول تھامے کھڑا ہے۔ شکاری نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ پھر پستول چھین کر اُسے زمین پر پٹخنی دی۔ مالبن اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا شکاری کی طرف بڑھا۔ شکاری نے اُسے ایک ہی ہاتھ میں لمبا لِٹا دیا۔

مریم کھڑی تھَر تھَر کانپ رہی تھی۔ شکاری نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا اور انگریزی زبان میں پوچھا۔ "اس نے تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟" مریم انگریزی زبان نہ جانتی تھی۔ وہ تو اب اپنی مادری زبان فرانسیسی بھی بھول چکی تھی۔ اُس نے جنگلیوں کی بولی میں کہا۔ "مجھے یہاں سے لے چلو۔ میری مدد کرو۔" پھر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

شکاری نے آگے بڑھ کر اسے تسلّی دی اور اس سے جنگلیوں کی بولی میں کہا۔ "تم مُجھ سے ڈرو نہیں۔ میں تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔"

اب مریم نے شکاری کو غور سے دیکھا۔ اس کا قد بہت اونچا اور جسم بہت بھاری تھا۔ وہ بہت طاقتور معلوم ہوتا تھا مگر اُس کی آنکھوں میں سختی نہیں،

ہمدردی اور رحم تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس شخص سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچائے گا۔

جب شکاری نے مریم سے پوچھا کہ یہ کیا قصّہ ہے تو اس نے سب حال بیان کر دیا اور پھر بولی۔ "یہ دونوں آدمی مُجھے خرید لائے ہیں، مگر مُجھے یہ معلوم نہیں کہ کہاں لے جا رہے ہیں۔ دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک مارا گیا۔"

مالبن شکاری کی طرف آنکھیں پھاڑے گھور رہا تھا۔ شکاری نے اُس سے کڑے لہجے میں کہا۔ "میں انسانوں کو غلام بنانے کے خلاف ہوں۔ اِس لیے اِس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اگر جنگل میں کوئی قانون اور انصاف ہوتا تو میں تُم کو قتل کے جرم میں پھانسی دلواتا مگر یہاں کوئی قانون نہیں ہے۔ اِس لیے تُم جا سکتے ہو مگر افریقہ سے جلد سے جلد باہر نکل جاؤ۔ اگر تم مجھے اس کے بعد یہاں نظر آئے تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔"

مالبن کھڑا سُنتا رہا۔ وہ خود کو سنبھال نہیں سکتا تھا اِس لیے کھڑا کھڑا جھول رہا تھا۔ شکاری کے خوف سے اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اور وہ اس کے

سامنے سے جلد سے جلد ہٹ جانا چاہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو پھر مار پیٹ کرنے لگے۔ اس نے جو دو پٹخنیاں کھائی تھیں، انھی سے جان نکلی جا رہی تھی۔ جب شکاری نے اپنی بات پوری کر لی تو مالبن گرتا پڑتا خیمے سے باہر نکل گیا۔ پھر باہر سے اُس کے مزدوروں کو چیخ چیخ کر حکم دینے کی آواز سُنائی دینے لگی۔ وہ اُن کو ہدایت دے رہا تھا کہ خیمے اُکھاڑو، شام تک یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔

شکاری نے مریم سے پوچھا۔ ”تمہارے گلے میں جو پٹّا پڑا ہوا ہے، اِس میں تالا لگا ہوا ہے، اس کی کنجی کس کے پاس ہے؟“

مریم نے جانسن کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ اجنبی نے لاش کے کپڑے ٹٹولے۔ ان میں سے کنجی نکل آئی۔

اس نے اس کنجی سے پٹّے کا تالا کھول دیا۔ مریم آزاد ہو گئی۔

اس نے شکاری سے پوچھا۔ ”تم مجھے کوراک کے پاس جانے دو گے؟“

"ہاں۔" شکاری نے کہا۔ "میں تمہارے لیے اس کا بندوبست کر دوں گا کہ تم اپنے آدمیوں کے پاس پہنچ جاؤ۔ مگر وہ کون لوگ ہیں اور اُن کا گاؤں کہاں ہے؟"

وہ لڑکی کے عجیب و غریب لباس کو دیکھ رہا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ جو زبان بول رہی ہے اس سے تو افریقہ ہی کی رہنے والی معلوم ہوتی ہے مگر صورت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ سفید نسل کی ہے۔

"تم کِن لوگوں میں سے ہو؟" اس نے مریم سے دریافت کیا۔

مریم خاموش رہی۔ اُسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس نسل کی ہے۔

"اور یہ کوراک کون ہے؟" شکاری نے پوچھا۔

کوراک کا نام سنتے ہی مریم کے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ وہ چمک کر بولی۔ "کوراک؟ کوراک تو گوریلا ہے۔"

"گوریلا؟" شکاری حیران تھا۔ "اور تم کن لوگوں میں سے ہو؟"

”میرے اور کوئی لوگ نہیں ہیں۔“ مریم نے جواب دیا۔ ”جو کچھ ہے کوراک ہی ہے۔“

شکاری نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ پھر اس سے پوچھا۔ ”کوراک کوئی گوریلا ہے؟ اور تم کون ہو؟“

”میں مریم ہوں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”یہ تو تمہارا نام ہے۔“ شکاری نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم نسل سے کون ہو؟“

”نسل سے؟“

”ہاں۔“ شکاری نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

”میں بھی گوریلا ہوں۔“ مریم نے تن کر کہا۔

”ارے“ کہہ کر اجنبی خاموش ہو گیا۔ مریم بھی خاموش کھڑی رہی۔

پھر اس شخص نے مریم سے پوچھا۔ ”تم کب سے گوریلا ہو؟“

”اس وقت سے۔“ مریم نے جواب دیا۔ ”جب میں بہت چھوٹی سی تھی۔

یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ کوراک پہنچا اور وہ میرے ماں باپ سے مجھے چھین کر لے آیا۔ اُس وقت میرا باپ مُجھے مار رہا تھا۔ جب کوراک مجھے اپنے ساتھ جنگل میں لے آیا تھا۔ اس وقت سے میں کوراک اور آہُٹ کے ساتھ درختوں پر رہتی ہوں۔" وہ آ کُوٹ کو آہُٹ کہا کرتی تھی۔

"تو کوراک جنگل میں رہتا ہے؟" شکاری نے پوچھا۔

"ہاں۔" مریم نے جواب دیا۔ "جنگل میں، گھنے درختوں میں۔"

"کہاں؟" اجنبی نے دریافت کیا۔ "کس جگہ؟ کس علاقے میں؟"

مریم نے ایک ہاتھ اُٹھا کر اُسے اس طرح گھمایا جیسے برّاعظم افریقہ کا آدھا حصّہ کوراک کا گھر ہے۔

اجنبی ہنسی نہ روک سکا۔ پھر اُس نے پوچھا۔ "تمہیں وہ راستہ آتا ہے جس سے تم کوراک تک پہنچ سکتی ہو؟"

"نہیں۔" مریم بولی۔ "مجھے وہ راستہ معلوم نہیں۔ مگر کوراک کسی نہ کسی

طرح مُجھ تک ضرور پہنچے گا۔"

"اچھا۔" اجنبی نے کہا۔ "تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ میرا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ میں تمہیں وہاں لیے چلتا ہوں۔ جب تک ہم کوراک کو یا کوراک ہمیں ڈھونڈ نہ نکالے، اس وقت تک میری بیوی تمہاری دیکھ بھال رکھے گی۔"

مریم کو اُس آدمی پر بھروسہ تھا۔ وہ بے کھٹکے اُس کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ مالبن کا قافلہ اس سے پہلے شمال کی طرف کُوچ شروع کر چکا تھا۔

شکاری اور مریم وہاں سے میلوں دُور نکل آئے تھے کہ اچانک ایک بڑا سا میدان آ گیا۔ سامنے وہ عمارتیں نظر آ رہی تھیں جو اس میدان میں بنی ہوئی تھیں۔ مریم حیرانی سے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا جگہ ہے؟" مریم نے اُن عمارتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میرا گھر ہے۔“ شکاری نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں میرے ساتھ میری بیوی اور نوکر چاکر رہتے ہیں۔ تم بھی یہیں رہو گی۔“

”مگر“ مریم نے اس طرح کہا جیسے اس کا دل خوف سے لرز رہا ہے۔ ”وہاں لوگ میرے ساتھ مار پیٹ کریں گے۔ میرا باپ بھی مجھے بہت مارا کرتا تھا۔ اِسی طرح یہ لوگ بھی ماریں گے۔“

شکاری بولا۔ ”نہیں، تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔“

مریم کہنے لگی۔ ”نہیں نہیں۔ تُم مُجھے جنگل میں واپس چلا جانے دو۔ وہاں کوراک مُجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ شاید اُسے یہ خیال ہی نہ گزرے کہ میں کسی سفید آدمی کے گھر میں رہ رہی ہوں، اِس لیے وہاں ڈھونڈنے ہی نہ آئے۔“

اجنبی سمجھ گیا کہ اصل میں وہ مار پیٹ کے ڈر سے ایسی باتیں کہہ رہی ہے۔ اس نے کہا۔ ”تم کو وہاں کوئی نہیں مارے پیٹے گا۔ کیا میں نے تم کو مارا پیٹا ہے؟ میری بیوی بھی میری ہی طرح ہے۔ وہ تم کو بہت اچھی طرح رکھے

گی۔ اتنے میں کوراک تم کو ڈھونڈ نکالے گا اور میں بھی اُس کی تلاش میں آدمی بھیجوں گا۔"

مریم نے سر ہلا کر انکار کیا۔ "وہ اُن کے ہاتھ نہیں آ سکتا۔ وہ تو اِن کو مار ڈالے گا۔ انسان تو اُسے مارنے کے جتن کرتے رہے ہیں۔ وہ اُن سے بیزار ہے۔ وہ اُن کے کبھی بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ مُجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تُم مجھے جانے دو۔"

"تم کو اپنے وطن کا راستہ معلوم نہیں ہے بچی۔ جنگل میں بھٹک جاؤ گی۔ شیر یا چیتے تم کو پھاڑ کھائیں گے۔"

مریم ہنسی۔ "جنگل تو میرا باپ ہے اور وہی میری ماں بھی ہے۔ وہ مجھ پر انسانوں سے زیادہ مہربان رہا ہے۔ مجھے جنگل سے کوئی خوف نہیں۔ مجھے تو اس سے محبّت ہے۔ مگر تم نے بھی میرے ساتھ بھلائی کی ہے اس لیے جیسا تم کہتے ہو، ویسا ہی کروں گی۔ کچھ دِن یہاں ٹھہر جاتی ہوں۔ اتنے میں کوراک مُجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ ہی جائے گا۔"

”ٹھیک۔“ کہہ کر اجنبی آگے آگے چلنے لگا۔ وہ دونوں اس بنگلے تک پہنچے جو پھول دار درختوں اور بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے پچھواڑے ایک فارم تھا جس میں مکان اور کھتّے بنے ہوئے تھے۔

بنگلے کی برساتی میں ایک عورت نے، جو سفید بُرّاق کپڑے پہنی ہوئی تھی، اجنبی کا استقبال کیا۔

اجنبی نے لڑکی سے کہا۔ ”یہ میری بیوی ہے۔“ پھر اس عورت سے بولا۔ ”یہ مریم ہے۔“ اسے مریم سے ملنے کا حال سنایا۔

مریم نے دیکھا کہ وہ عورت بڑی خوبصورت اور نیک ہے۔ وہ مریم سے شفقت سے پیش آئی اور جب اس نے مریم پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ بے چاری غریب بچی۔ تو مریم کا دل اس کی طرف کھنچنے لگا۔ اب وہ اس عورت سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھی۔ اس عورت کی آواز اور لہجے میں ماں کی مامتا تھی۔ مریم کو یہ لہجہ سُنے ہوئے اتنے سال گزر چکے تھے کہ وہ اسے بالکل ہی بھول گئی تھی۔ اس عورت نے اپنے محبّت بھرے بولوں سے

مریم کے دل میں ماں کی یاد تازہ کر دی۔ اس نے اپنا چہرہ اس عورت کی چھاتی پر رکھ کر رونا شروع کر دیا اور اتنا روئی کے زندگی بھر اتنا نہیں روئی تھی مگر اس کا یہ رونا خوشی کا رونا تھا۔

یوں مریم، جو جنگلی درندوں کی طرح زندگی گزار رہی تھی، ایک شریف انسان کے گھر میں آ گئی۔

# پہاڑی گوریلوں کا حملہ

جنگل کے گھَن میں کوراک گوریلوں کے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اُس کے سارے جسم پر زخم ہی زخم تھے۔ اُس کا خون غصّے سے کھول رہا تھا۔ یہ غصّہ اس بات پر آ رہا تھا کہ کوڈو کے گاؤں والوں نے اسے زخمی بھی کر دیا تھا اور اس کی مریم کو بھی اُس سے چھین لیا تھا۔ آپ وہ اُن سے لڑنے کے لیے گوریلوں سے مدد مانگنے جا رہا تھا۔

وہ اس جگہ پہنچا تھا جہاں انہیں پچھلی مرتبہ دیکھا تھا مگر وہاں نہیں ملے تھے

اس لیے اب وہ ان کے پاؤں کے نشانوں پر چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

آخر اس نے اُنہیں جا لیا۔

وہ جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ اس موسم میں گوریلے ٹھکانا بدلا کرتے ہیں۔ اُسے دیکھ کر چلتے چلتے رُک کر کھڑے ہو گئے۔ پھر خوب غرّائے اور بڑبڑائے اور اکڑ اکڑ کر اس کے گرد چکّر بھی کاٹے۔

کوراک نے آ کُوٹ کو پکارا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑتا ہوا آیا اور سُوں سُوں کرتے ہوئے اس کے گرد چکّر کاٹنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔ ”تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ اب کہیں نہ جانا۔ ہمارے ساتھ ہی رہنا۔ ہم اور تُم مل کر شکار کریں گے۔“

کوراک نے کہا۔ ”میں ایسی حالت میں شکار کیسے کر سکتا ہوں جبکہ کالے آدمیوں نے میری مریم کو چھین لیا ہے۔ انہوں نے اس کو اپنے ہاں قید کر رکھا ہے۔ اُسے میرے پاس نہیں آنے دیتے۔ میں اکیلا مریم کو اُن کی قید سے نہیں چھُڑا سکتا۔ مُجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تُم مریم کو قید سے

چھٹکارا دلواؤ۔"

آ کُوٹ کہنے لگا۔ "ان کالے آدمیوں کے پاس بہت سی دھار دار لکڑیاں ہیں۔ اُن سے گوریلوں کے جسم چھِد جاتے ہیں۔ وہ اِن لکڑیوں سے ہم سب کو مار ڈالیں گے۔ وہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ اگر ہم اُن کے گاؤں کے اندر قدم رکھیں گے تو وہ ہم میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑیں گے۔"

یہ کہہ کر اُس نے بعض بوڑھے گوریلوں کی طرف دیکھا جیسے صلاح لیتا ہے۔

ایک بُڈھے نے کہا۔ "ہماری تعداد بہت کم ہے۔"

مگر دوسرا بولا۔ "پہاڑی گوریلوں کو ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ وہ تو اَن گنت ہیں۔ جن کالے آدمیوں نے اِس گوریلے کی مادہ کو چھینا ہے، ان سے پہاڑی گوریلے بہت جلے ہوئے ہیں۔ وہ اُن پر خوشی خوشی حملہ کریں گے اور وہ ہیں بھی بڑے خون خوار۔ ہمیں چاہیئے کہ اُن کو ساتھ ملا لیں۔ وہ کالے آدمیوں کے چیتھڑے اُڑا دیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر بڑے ہولناک طریقے سے غرّایا اور ساتھ ہی اس کے بال بھی کھڑے ہو گئے۔

اس کی صلاح اور سب نے بھی مان لی۔ کوراک نے ان سے کہا کہ جو کچھ کرنا ہے، جلد کر ڈالو۔ اس پر آ کُوٹ ایک درجن گوریلوں کو ساتھ لے کر اُسی وقت روانہ ہو گیا۔

دو دِن بعد وہ پہاڑی گوریلوں کے پاس پہنچ گئے۔ کوراک نے اُن کے سامنے اپنا مطلب بیان کیا تو وہ راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ ہو لیے۔ اگلے دِن وہ کوڈو کے گاؤں پہنچ گئے۔ کوراک کے ساتھ تین ہزار گوریلے تھے۔ اس کے اشارے پر وہ گاؤں پر ٹوٹ پڑے۔ گاؤں والے ان سے دہشت کھا کر بھاگنے لگے۔ کوراک اُس جھونپڑی کی طرف لپکا جس میں مریم قید تھی۔

مگر وہ خالی پڑی تھی۔ کوراک نے ایک ایک کر کے اور جھونپڑیاں دیکھنی شروع کر دیں۔۔۔ مگر وہ ان میں سے کسی جھونپڑی میں بھی نہ ملی۔

کوراک سمجھا کہ وحشیوں نے اسے مار ڈالا۔ اس کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔

اُس پر انتقام کا بھُوت سوار ہو گیا اور اب وہ یہ ارادہ کر کے میدان میں نکلا کہ گاؤں والوں میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑے گا۔

دُور سے گوریلوں کی غرّاہٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جن میں اُن کے شکاروں کی چیخوں کی آوازیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ کوراک اسی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں پہنچ کر اس نے کوڈو کے آدمیوں پر زخمی شیرنی کی طرح حملے شروع کر دیے اور جو سامنے آیا اسے مار ہٹایا۔ گاؤں والے لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر کوڈو اپنے بکھرے ہوئے آدمیوں کو پھر جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ اس قدر ڈر گئے تھے کہ اب اس علاقے میں گھُس کر اپنا سامان اٹھالانے کو بھی تیّار نہ ہوئے اور بھاگنے لگے۔

یوں کوراک نے اُنہی لوگوں کو بھگا دیا جن سے اسے مریم کی تلاش میں مدد مل سکتی تھی۔

# ایک آدمی اور ایک شیر

مریم اجنبی شکاری کو ابّا اور اس کی بیوی کو امّاں جی کہنے لگی تھی۔ انہوں نے ایک شخص کو کوڈو کے گاؤں کی طرف روانہ کر دیا تھا تاکہ یہ معلوم کر کے آئے کہ یہ لڑکی ان لوگوں کے ہاتھ کس طرح لگی تھی اور کوراک کون ہے۔

یہ آدمی ایک مہینے بعد لوٹا تو اس نے یہ بُری خبر سنائی کہ کوڈو کا گاؤں ویران پڑا ہے وہاں نہ کوئی انسان ملا نہ گوریلا۔

مریم ضد کرنے لگی کہ وہ خود جا کر کوراک کو ڈھونڈے گی۔ مگر اُس کے منہ بولے باپ نے اُسے یہ کہہ کر روک لیا کہ کچھ دِن ٹھہر جاؤ، میں خود اُسے ڈھونڈنے نکلوں گا۔

اب مریم سترہ برس کی ہو گئی تھی مگر ہاتھ پاؤں کی اچھی ہونے کی وجہ سے اُنّیس بیس کی معلوم ہوتی تھی۔ اب وہ انگریزی بھی پڑھنے لکھنے اور بولنے لگی تھی۔

انہی دِنوں وہاں تین انگریز مرد اور دو عورتیں آئیں۔ یہ لوگ مریم کی منہ بولی امّاں کے مہمان تھے۔ عورتیں دو مردوں کی بیویاں تھیں۔ تیسرا مرد بن بیاہا تھا۔ اس کا نام ماریسن تھا۔ وہ بڑا مال دار آدمی تھا۔ اُسے کھانے پینے اور دل بہلانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ افریقہ اس لیے چلا آیا تھا کہ شکار کا لطف اٹھائے۔ امیر ہونے کی وجہ سے اس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی تھی، اس لیے وہ ضدّی اور خود غرض انسان بن گیا تھا۔ پھر بھی کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرتا تھا۔ مریم کے منہ بولے ماں باپ نے مہمانوں کو

مریم کے بارے میں صرف یہ بتایا کہ وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئی ہے اور ہم انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ شروع شروع میں مریم مہمانوں سے شرماتی اور اُن سے الگ الگ سی رہتی۔ پھر اُن میں گھُل مل گئی۔ وہ جنگل کے ہر مقام سے واقف تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بھینسا کہاں چھپتا ہے، شیر کہاں رہتا ہے اور جوہڑ کہاں کہاں ہیں۔ وہ یہ بھی بتا سکتی تھی کہ شکار کس جگہ جا کر چھپا ہے۔ مگر اس کی اس صفت نے سب کو اچنبھے میں ڈال دیا وہ یہ تھی کہ دوسروں کو جو شیر نظر نہ آتا، وہ اُس کے بارے میں فوراً بتا دیتی تھی۔

ماریسن مریم کو بہت پسند کرنے لگا تھا اور ہر وقت اسی کے ساتھ رہتا۔ مریم کو بھی وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ ہر وقت ماریسن کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کے دِل سے کوراک کی یاد دُور ہونے لگی۔

جب کبھی مریم کا منہ بولا باپ شکار کے لیے جایا کرتا وہ بھی خوشی خوشی اس کے ساتھ جاتی تھی۔ اُسے بھاگتے ہوئے حیوان کا پیچھا کر کے اس کا

ٹھکانہ ڈھونڈ نکالنے میں بڑا لطف آتا تھا مگر اسے حیوانوں کو جان سے مارنے کے لیے ان کا شکار کرنا پسند نہ تھا۔ اس لیے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ شکار کو نہ جاتی تھی۔ یا تو برآمدے میں منہ بولی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی اس سے باتیں کرتی رہتی تھی یا اپنی پسند کے گھوڑے پر بیٹھ کر جنگل کے سِرے پر جا پہنچتی تھی۔ وہاں وہ درختوں میں جھومتی اور انہیں پھلانگتی ہوئی کسی موٹے سے تنے پر پھیل کر لیٹ جاتی۔

ایک دِن وہ ایک تنے پر لیٹی کوراک کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک کچھ فاصلے سے ایک میمنے کے خوف سے ممیانے کی آواز سنائی دی۔ مریم فوراً چوکس ہو گئی۔ اِس آواز کا مطلب یہ تھا کہ شیر اُس میمنے کے بہت قریب آگیا ہے۔ کوراک کو شیر کے مُنہ سے اس کا شکار چھین کر بہت لطف آتا تھا اور مریم بھی اس کے ساتھ اس مزے دار شغل میں حصّہ لیتی رہی تھی۔ اِس وقت وہ ایک بار پھر یہ کھیل کھیلنے کو تیّار ہو گئی۔ اُس نے جوتے اور کپڑے اتارے اور شکاری چاقو اور بندوق سمیت بڑی تیزی سے

میمنے کی آواز کی طرف بڑھی۔

اسے یہ حیرانی تھی کہ میمنے کی آواز ایک ہی جگہ سے کیوں آ رہی ہے، وہ بھاگ کیوں نہیں جاتا۔ مگر جب وہ اس ننھے سے حیوان کے قریب پہنچی تو سمجھ گئی کہ اس کے اپنی جگہ سے نہ ہل سکنے کی وجہ کیا ہے۔

میمنا جوہڑ کے قریب ایک کھونٹے سے بندھا ہوا تھا اس لئے بھاگ نہ سکتا تھا۔

مریم نے رُک کر جلدی سے درخت کی کٹی ہوئی جگہ پر نظر ماری۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ شیر کہاں ہے۔ اگلے لمحے وہ اس کے دائیں ہاتھ کو جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں لیٹا دکھائی دیا۔ ہوا میمنے کے رُخ کی تھی، اس لیے اسے شیر کی بُو آ رہی تھی اور وہ ممیا رہا تھا۔

مریم نے تاڑ لیا کہ چکر کاٹ کر میمنے کے پاس پہنچ جانا اور اس کی رسّی کاٹ دینا کوئی مشکل نہیں اور یہ کام پل بھر میں ہو سکتا ہے، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ شیر اسی پر حملہ کر دے۔ اس صورت میں درختوں پر چڑھ کر جان

بچانے کا موقع نہ مل سکے گا۔

مگر میمنے کی بے بسی پر مریم کو اتنا ترس آیا کہ وہ اپنی جان کی سلامتی نہ کرتے ہوئے پرلے رُخ کے درختوں تک پہنچ گئی۔ اگلے لمحے اس نے رُک کر شیر کی طرف نظر کی اور اسی لمحے شیر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مریم چاقو لے کر زمین پر کودی اور تیزی سے دوڑ کر میمنے کے پاس پہنچ گئی۔ شیر نے اُسے دیکھا تو دل دہلانے والی آواز میں گرجا، مگر جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ وہ حیران تھا کہ جنگل میں سے اچانک یہ کون بھُوت نکل آیا ہے۔ شیر کے علاوہ ایک سفید انسان بھی ایک کانٹے دار جھاڑی میں چھُپا بیٹھا تھا۔ وہ مریم کو میمنے کی طرف دوڑتا دیکھ کر اُٹھنے لگا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ شیر لڑکی پر جھپٹتے ہوئے ہچکچا رہا ہے تو بندوق سے شیر کے سینے کو نشانہ بنا لیا۔ مریم نے میمنے کی رسّی کاٹ دی۔ میمنا ممیا کر جنگل میں غائب ہو گیا۔ مریم درخت کی طرف لپکی۔

سفید انسان نے اُس کے مڑتے میں اس کا چہرہ دیکھا تو تعجّب سے ہانپ اٹھا۔

مگر اس وقت اسے شیر کی طرف توجّہ کرنی تھی جو غصّے میں بھر کر حملہ کر رہا تھا۔ سفید آدمی فائر کر کے اُسے روک سکتا تھا مگر وہ ہاتھ روکے رہا۔ اُس نے شیر کو نشانہ تو بنائے رکھا مگر لڑکی کے شیر سے جان بچانے کا تماشہ دیکھنے لگا۔

ایک مرتبہ ایسا نازک موقع آ گیا کہ لڑکی کی جان بچنا ناممکن نظر آنے لگا تو شکاری نے انگلی لبلبی پر ہلکے سے کس لی مگر اس لمحے لڑکی نے اچھل کر ایک شاخ تھام لی۔ شیر نے چھلانگ ماری لیکن مریم پلک جھپکتے میں اس کی پہنچ سے نکل چکی تھی۔

سفید انسان نے چین کا سانس لیا اور بندوق جھکا لی۔ اُدھر لڑکی نے شیر کے گرجنے پر قہقہہ مارا اور پھر تیزی سے چل دی۔

شیر گھنٹا بھر تک جوہڑ کے آس پاس پھرتا رہا اور غصّے سے گرجتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔

شکاری جھاڑی سے نکل کر اپنے کیمپ میں پہنچ گیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم

آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر پیلے رنگ کی گھنی ڈاڑھی تھی۔

کیمپ میں پہنچ کر وہ فوراً اپنے خیمے کے اندر گھُس گیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ باہر نکلا تو اس کی ڈاڑھی غائب تھی۔

اس کے نوکروں نے اس کی طرف دیکھا تو حیرت سے منہ تکتے رہ گئے۔ مریم اس درخت پر پہنچی جس پر اپنے کپڑے رکھ گئی تھی مگر وہاں بہت سے بندر اسے پھاڑ پھینکنے کی تیّاری کر رہے تھے۔ وہ اسے دیکھتے ہی غُرّانے لگے اور دانت نکال لیے۔ وہ اکیلی تھی۔ انہیں ڈر کاہے کا تھا۔

ادھر ماریسن اپنی پارٹی کے ساتھ شکار سے لوٹ رہا تھا۔ جنگل کے سِرے پر مریم کا گھوڑا کھڑا دیکھ کر وہ اِدھر آیا تو دیکھا کہ بندر کسی پر دانت نکال رہے ہیں۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ مریم ہے۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے مگر اگلے لمحے مریم نے جو حرکت کی اس پر تو ماریسن کو اتنا سخت تعجّب ہوا کہ بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر گِر پڑی۔ مریم بھی بندروں جیسی آوازیں نکالنے لگی تھی۔ بندروں نے فوراً خوخیانہ بند کر دیا اور اس کی

بات سننے لگے۔ مریم اُن سے کئی منٹ تک باتیں کرتی رہی۔ پھر بندروں نے اس کے کپڑے اس کے حوالے کر دیئے۔

جب وہ کپڑے پہننے لگی تو بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے باتیں کرتے رہے جن کا مریم جواب دیتی رہی۔

ماریسن ایک درخت کے تلے بیٹھا پیشانی کا پسینہ پونچھتا رہا۔ پھر اُٹھا اور اس طرف چل دیا جہاں اس کا گھوڑا کھڑا تھا۔

چند منٹ بعد جب مریم جنگل سے باہر نکلی تو اس نے ماریسن کو وہاں کھڑا پایا مگر وہ اسی کی طرف ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جن میں حیرانی بھی تھی اور دہشت بھی۔ وہ مریم سے کہنے لگا۔ "میں آپ کا گھوڑا دیکھ کر رُک گیا تھا کہ ساتھ ہی گھر چلیں گے۔ آپ کوئی خیال تو نہیں کریں گی؟"

"جی نہیں۔" مریم نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں بلکہ مجھے تو آپ کے ساتھ گھر جانے میں خوشی ہو گی۔" ماریسن راستے میں مریم کی نظر بچا کر اس کی طرف دیکھتا اور دل میں حیران ہوتا رہا کہ اس کی نظروں نے دھوکا کھایا، یا

اِس نے واقعی اس لڑکی کو بندروں سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی مگر اس نے اپنی آنکھوں سے ہوتی دیکھی تھی۔

اس بات کا خیال کر کے ماریسن کو ایک بار پھر پسینہ چھوٹنے لگا اور اس نے ماتھے پر پسینہ پوچھا۔

مریم نے پوچھا۔ ”آپ کو پسینہ کیوں آرہا ہے؟ شام ہو رہی ہے۔ اس وقت تو ٹھنڈک ہے۔“

ماریسن نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک درخت پر چڑھے ہوئے بندروں سے باتیں کرتے دیکھ چکا ہوں، اس لیے ڈر کے مارے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔“

مریم نے ہلکے سے اچنبھے سے کہا۔ ”مگر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ وہ تو میرے دوست ہیں۔“

”دوست“ ماریسن بھونچکا رہ گیا۔ ”وہ ڈراؤنے حیوان آپ کے دوست ہیں؟“

"ہاں۔" مریم بولی۔ "بڑے گہرے دوست۔" اور پھر اور زیادہ ڈرانے کے لیے کہنے لگی۔ "کچھ ہی عرصہ پہلے میں جنگل کے درندوں میں رہا کرتی تھی۔ وہیں میں نے ان کی زبان سیکھی تھی۔ میرا گھر درختوں میں تھا۔ آہُٹ اور کوراک میرے بڑے گہرے دوست تھے۔ وہ بھی وہیں میرے ساتھ رہا کرتے تھے۔"

"آہُٹ اور کوراک؟" ماریسن نے یہ دونوں لفظ دُہرائے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔ پوچھنے لگا۔ "یہ آہُٹ اور کوراک کون ہیں؟"

کوراک کا نام آتے ہی مریم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے کہا۔ "کوراک ایک سفید گوریلا ہے۔ اس جیسا زبردست گوریلا دنیا بھر میں کہیں نہیں ہے۔ آہُٹ اُس کا دوست ہے۔" ماریسن کی خاک سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ مریم کی باتیں اس کے دماغ میں نہیں بیٹھ رہی تھیں۔ مگر مریم ایک عجوبہ لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی

خوبصورت بھی تھی۔ اس لیے اچانک ماریسن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسی سے شادی کرے گا۔ ماریسن اس قسم کا انسان تھا کہ جس کسی چیز کے متعلّق فیصلہ کر لیتا کہ وہ لینی ہے تو پھر اڑ جاتا کہ اب لے کر ہی رہے گا۔ امیر کا بچّہ ہونے کی وجہ سے اس کی عادتیں بگڑ گئی تھی۔

اچانک اس نے مریم سے پوچھا۔ ”یہ سفید گوریلا کوراک کون ہے؟ کیا اس کے سارے جسم پر اس طرح بال ہیں جس طرح گوریلوں کے ہوتے ہیں؟“

مریم نے سر ہلا کر بتایا کہ یہ بات نہیں ہے۔ ماریسن نے پوچھا۔ ”تو کیا وہ کوئی سفید انسان ہے جو جنگل میں رہ رہا ہے؟“

”ہاں۔“ مریم نے جواب دیا۔ ”وہ بڑا زبردست سفید انسان ہے۔“

”کیا وہ تمہارا۔۔۔ شوہر تھا؟“ ماریسن نے پوچھا۔

”شوہر؟“ مریم زور سے ہنسی۔ ”نہیں۔ وہ میرے ساتھ بڑے بھائی کی

طرح پیش آتا تھا۔"

ماریسن کی تسلّی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ مریم کو لندن اور پیرس کے حالات سناتا رہا کہ کس طرح وہاں کی عورتیں بڑھیا لباس اور قیمتی زیور پہنتی ہیں، کس طرح وہاں شاندار دعوتیں ہوتی ہیں اور اس جیسے امیر آدمی کیسے مزے کرتے ہیں۔ مریم کو یہ باتیں جادو کی کہانیاں معلوم ہوئیں اور وہ انہیں بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

# یورپی تاجر

ایک دِن مریم کے مُنہ بولے ماں باپ کے ہاں یورپ کا ایک تاجر آیا۔ وہ اُونچے قد اور مضبوط جسم کا تھا۔ مریم کا منہ بولا باپ جب اُس سے ملا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ اِس سے پہلے کہیں مل چکا ہے، مگر یہ یاد نہ کر سکا کہ کہاں ملا تھا۔ تاجر نے بتایا کہ وہ شمال کی طرف سے سے تجارت اور شکار کرنے کے لیے آیا ہے۔ آج صُبح اپنے کیمپ سے شکار کرنے نکلا تو مریم کے مُنہ بولے باپ کے مکان کی چمنی سے دھواں نکلتا دیکھ کر اِدھر آ گیا۔ اُس نے اجازت چاہی کہ اپنا کیمپ قریب لا کر یہاں شکار کر لے۔ مریم کے باپ

نے اجازت دے دی۔ پھر اُس نے تاجر کو مکان کے اندر لے جا کر اُس کا اپنی بیوی اور مریم سے تعارف کرایا اور پھر اُسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

مریم نے اُس کے جاتے ہی مُنہ بولی ماں سے کہا۔ ”میں اِس شخص کو پہلے دیکھ چکی ہوں، مگر ٹھیک طرح نہیں بتا سکتی کہ کہاں دیکھا تھا۔“

اس کے بعد یورپی تاجر، جس نے اپنا نام ہینسن بتایا، کبھی کبھی اُن کے ہاں آ نکلتا۔ مگر جب بھی آتا، گھر کی عورتوں سے پرے ہی پرے رہتا۔ یہ ہینسن تین ہفتے رہا۔ پھر جانے کی تیّاری کرنے لگا۔ اُس نے یہ ترکیب کی تھی کہ جو آدمی اس کے ساتھ تھے ان کی دو ٹولیاں بنا کر ایک کو شمال کی طرف اُس پگڈنڈی پر روانہ کر دیا تھا، جو قافلے کے اُس راستے پر جا نکلتی تھی جو جنوب کی طرف سے صحرائے اعظم میں داخل ہوتا تھا اور دوسری کو یہ حکم دے کر آگے چلتا کر دیا تھا کہ مغرب کی طرف بڑھ کر اس دریا کے پرے پڑاؤ ڈال لے، جو اِس علاقے کی قدرتی حد تھا، جس پر مریم کے منہ بولے باپ نے اپنا کیمپ قائم کر رکھا تھا۔

ایک رات گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے مریم کو نیند نہ آئی تو وہ اُٹھ کر باغ میں جا نکلی۔ ہینسن ایک جھاڑی کے پیچھے اس طرح لیٹا تھا جیسے شکار کی تاک میں ہے۔ جب اس نے مریم کی آہٹ سنی تو کہنیوں کے سہارے اُٹھ کر دیکھنے لگا۔ دس بارہ قدم پر اُس کا گھوڑا کھڑا تھا جس کی لگام جھاڑی کی ایک باڑھ کے کھمبے سے اٹکا دی گئی تھی۔

مریم ٹہلتے ٹہلتے اس جھاڑی تک جا پہنچی جس کے پیچھے ہینسن لیٹا تھا۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک بڑا سا رومال نکالا اور آواز کیے بغیر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ کچھ فاصلے سے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہاں سے بہت دُور میدان میں شیر گرجا۔ ہینسن اکڑوں بیٹھ گیا تا کہ پھُرتی سے اُٹھ کر کھڑا ہو سکے۔

ایک بار پھر گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ اب کے یہ آواز زیادہ قریب سے سُنائی دی۔ پھر گھوڑے کے اس جھاڑی کے قریب سے ہو کر نکلنے کی آواز ہوئی جس کے پیچھے ہینسن چھپا بیٹھا تھا۔

ہینسن نے سر گھما کر گھوڑے کی طرف دیکھا تو خود زمین پر لیٹ کر جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ ایک مرد دو گھوڑے لیے ہوئے آ رہا تھا۔ مریم چلتے چلتے رُک کر گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سُننے لگی۔ ایک لمحے بعد ماریسن دو کسے ہوئے گھوڑے لیے ہوئے نمودار ہوا۔

مریم نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ماریسن نے دانت نکوس دیئے۔ کہنے لگا۔ ”مجھے نیند نہیں آئی۔ گھوڑا لے کر نکلا تو آپ نظر آئیں۔ میں نے سوچا آپ کو بھی ساتھ لے لوں۔“ مریم بہت خوش ہوئی اور شکریہ کہہ کر ساتھ ہو لی۔

ہینسن یہ دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ جب مریم اور ماریسن باغ سے گُزر کر دروازے پر پہنچے تو وہاں ہینسن کا گھوڑا کھڑا دیکھا۔

ماریسن بولا۔ ”ارے، تاجر کا گھوڑا کھڑا ہے۔“

مریم نے کہا۔ ”شاید وہ ابّا جی سے ملنے آیا ہوا ہے۔“

ماریسن کہنے لگا۔ ”اتنی رات گئے؟“

اتنے میں دُور کہیں شیر پھر گرجا۔ ماریسن کانپ اُٹھا اور اُس نے کنکھیوں سے مریم کی طرف یہ معلوم کرنے کے لیے دیکھا کہ اُس پر شیر کی گرج کا کیا اثر ہوا ہے، مگر وہ تو ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے شیر کی آواز کان میں پڑی ہی نہیں۔

اگلے لمحے وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ میدان سے گُزرنے لگے، جو چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ مریم نے اپنے گھوڑے کو جنگل کی طرف موڑا، جس میں بھوکے شیر کی آواز آرہی تھی۔

ماریسن بولا۔ ”شاید آپ نے شیر کی آواز نہیں سُنی؟“

مریم نے کہا۔ ”سُنی ہے۔“

”تو پھر؟“ ماریسن بولا۔ ”اس سے بچ کر نِکل جانا چاہیے۔ مگر آپ تو اُسی کی طرف جارہی ہیں۔“

مریم کہنے لگی۔ ”کیوں؟ بچ کر کیوں نکلیں؟ ہم اُس کے سامنے پہنچ کر اُسے للکاریں گے۔“

ماریسن کھوکھلی ہنسی ہنس دیا۔ شیر دو دِن، دو رات کا بھوکا تھا۔ انسانوں کی بُو سونگھتے ہی وہ اُنہیں کھانے کو تیّار ہو گیا۔ اُس نے جنگل میں ایک چکّر کاٹا، تاکہ اُس رُخ پر ہو جائے جِدھر سے اُس کی بُو انسان کو نہ پہنچ سکے۔ شیر بھُوکا ضرور تھا مگر وہ بوڑھا ہونے کی وجہ سے بڑا اخرانٹ تھا۔

ٹھیک اسی وقت جنگل میں کوئی اور شخص بھی ایسا موجود تھا جس کے نتھنوں میں شیر اور انسان کی بُو پہنچی اور وہ سر ایک طرف جھُکا کر آہٹ لینے لگا۔

مریم نے ماریسن سے کہا۔ ”آیئے، جنگل کے اندر چلیں۔ رات بڑی سہانی ہے۔“

ماریسن جھجکا تو مریم بولی۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ابّا کہتے تھے، یہاں دو برس سے کوئی آدم خور شیر نہیں آیا۔“

ماریسن نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”میں شیر سے نہیں ڈرتا۔“
اور گھوڑا درختوں کے اندھیروں میں بڑھا دیا۔ اُس کے پیچھے مریم تھی اور
آگے شیر، جو جھنجھلایا ہوا شکار کی تلاش میں پھِر رہا تھا۔

جب مریم اور ماریسن گھر سے نکلے تھے تو ایک گھُڑسوار اُن کا پیچھا کر رہا تھا۔
یہ ہینسن تھا۔ جب یہ دونوں جنگل میں گھُس گئے تو پیچھا کرنے والا شخص
اس جگہ پر پہنچا، جہاں یہ دونوں جنگل کے اندر داخل ہوئے تھے۔

مریم اور ماریسن ایک ایسے مقام پر رُک گئے تھے جہاں درخت نہیں تھے۔
اُن سے سو گز اُدھر شیر ایک جھاڑی تلے دُبکا ہوا اُنہیں تاک رہا تھا۔

شیر کے پیچھے وہ شخص تھا جس نے شیر اور انسانوں کی بُو سُونگھی تھی۔ یہ
کوراک تھا اور ایک درخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے عین نیچے ایک ہاتھی
اندھیرے میں کھڑا جھوم رہا تھا۔ اُس کا نام ”ٹنیٹر“ تھا۔ کوراک اُس کی پیٹھ
پر کُود گیا اور اُس کے کان میں کچھ کہا، جس پر ہاتھی نے وہ بُو سُونگھنے کے
لیے اپنی سونڈ اُٹھا کر اُوپر جھلائی اور پھر مُڑ کر شیر اور انسانوں کی طرف چلنے

لگا۔ شیر انسانی گوشت کھانے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ غرّا کر اپنی دم کی

سونٹی مار رہا تھا۔

اُدھر ماریسن اور مریم خطرے سے بے پرواہ، پاس پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

ماریسن مریم سے کہہ رہا تھا۔ ”تُم میرے ساتھ لندن چلی چلو۔ اِن لوگوں کو ایک دِن بعد پتہ چلے گا کہ تُم میرے ساتھ نِکل گئی ہو۔“

مریم بولی۔ ”مگر ہمیں اِس طرح جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ابّا اور امّاں یہ تو نہیں کہیں گے کہ تُم دونوں شادی نہ کرو۔“

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کے ٹھیک اُسی لمحے ہاتھی نے درختوں میں سے اپنا سر نکالا۔

کوراک نے مریم کو دیکھ تو لیا مگر اس کے کپڑوں کی وجہ سے پہچانا نہیں۔ وہ یہی سمجھا کہ ایک مرد کسی عورت کے ساتھ بیٹھا ہے۔ ماریسن اور مریم نے ہاتھی کا سر نہیں دیکھا مگر شیر نے دیکھ لیا اور فوراً حملہ کر دیا۔ کیونکہ اُسے یہ اندیشہ ہوا کہ ہاتھی اُس کے شکار کو ڈرا کر بھگا دے گا۔ وہ حملہ کرنے میں اتنے زور سے دھاڑا کہ زمین کانپنے لگی۔

ماریسن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اُس کے ہوش و حواس رُخصت ہو گئے اور اگلے لمحے وہ گھوڑے پر بیٹھ کر اُسے ایڑ لگاتا ہوا میدان کی طرف سرپٹ بھاگا۔

مریم کا گھوڑا بھی چیخ اُٹھا اور لگا ماریسن کے پیچھے بھاگنے۔ مریم اُچک کر اُس پر سوار ہو گئی۔

کوراک نے ٹنیٹر کو آگے بڑھایا اور شیر پر اپنا بھاری نیزہ کھینچ مارا۔ مریم کا گھوڑا شیر کی زد پر تھا مگر شیر مریم پر جھپٹا۔ اِدھر مریم گھوڑے کی پیٹھ سے اُچھل کر ایک درخت پر چڑھ گئی۔ اُس کا گھوڑا آگے بھاگ گیا۔ شیر نے نیزہ اپنے کندھے سے نوچ کر پھینکنا چاہا مگر نہ پھینک سکا، پھر گھوڑے کے پیچھے دوڑا۔ کوراک نے ٹنیٹر کو جنگل کے اندر ریل دیا۔ وہ خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہینسن جنگل تک پہنچا ہی تھا کہ اُس نے شیر کی دھاڑ سُنی۔ اگلے لمحے اُس نے ماریسن کو بھاگتے دیکھا۔ اُس کے پیچھے دوسرا گھوڑا نمودار ہوا، جس کا سوار غائب تھا۔ ہینسن بندوق تانے ہوئے آگے بڑھا۔ اگلے لمحے شیر نظر

آیا۔ ہینسن سمجھ گیا کہ مریم اُس کے ہتھے نہیں چڑھی۔ اس نے شیر کو گولی مار کر ٹھنڈا کر دیا اور جنگل میں گھُس کر مریم کو پُکارنے لگا۔

مریم درخت سے اُتر کر اُس کے ساتھ ہو لی۔ آگے چل کر ماریسن بھی مِل گیا۔ وہ کہنے لگا۔ "میرا گھوڑا بے قابو ہو کر بھاگ نکلا تھا۔" ہینسن نے دانت نکوسے کیونکہ وہ اُسے گھوڑے کو بھگاتے ہوئے دیکھ چکا تھا، مگر اُس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ ماریسن نے مریم کو اپنے پیچھے بٹھا دیا اور تینوں خاموشی سے بنگلے پر واپس آ گئے۔

ادھر کوراک نے جنگل سے نکل کر اپنا نیزہ مردہ شیر کے جسم میں سے کھینچ لیا۔ وہ ابھی تک مُسکرا رہا تھا کیونکہ جو تماشہ دیکھا تھا وہ اس کے لیے بڑا مزیدار تھا۔ البتّہ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ عورت اتنی پھُرتی سے گھوڑے کی پیٹھ سے اُچھل کر درخت پر کیسے چڑھ گئی۔ اُس کی یہ حرکت بالکل مریم جیسی تھی۔

کوراک نے ٹھنڈا سانس بھرا اور جنگل میں چلا گیا۔

# دھوکا

بنگلے پر مریم کے منہ بولے باپ نے ہینسن کے فائر کی آواز سُن کر یہ سمجھا کہ ہینسن کو بنگلے سے اپنے کیمپ کی طرف جاتے میں حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور اپنے کھیتوں میں جا کر ملازموں سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ہینسن تو کئی گھنٹے پہلے جا چکا ہے۔ ابھی وہ پوچھ گچھ کر ہی رہا تھا کہ ماریسن، مریم اور ہینسن، تینوں کو بنگلے کی طرف آتے دیکھا۔

ماریسن نے جو کچھ کہا اس کی طرف مریم کے منہ بولے باپ نے توجّہ نہیں

کی۔ مریم تاڑ گئی کہ وہ ناراض ہے اس لیے خاموش رہی۔

اس نے پہلے مریم کو اس کے کمرے میں بھیجا پھر ماریسن سے کہا کہ وہ ڈرائنگ روم میں انتظار کریں، اس سے کچھ باتیں کرے گا۔ اِس کے بعد اُس نے ہینسن سے دریافت کیا کہ وہ ان دونوں کے ساتھ کیوں گیا تھا۔

ہینسن کہنے لگا۔ ''میں باغ میں بیٹھا تھا۔ وہاں مجھے نیند آ گئی۔ پھر دو انسانوں کے باتیں کرنے کی آوازوں سے آنکھ کھُل گئی مگر یہ نہ سُن سکا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ پھر ماریسن دو گھوڑے لے کر آیا اور مریم اور وہ دونوں اُن پر بیٹھ کر چل دیے۔ مُجھے خیال ہوا ایک لڑکی کو اتنی رات جنگل میں نہیں جانا چاہیے۔ اِس لیے اُن کا پیچھا کرنے لگا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میں اُن کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ کیونکہ جب شیر نے حملہ کیا تو ماریسن مریم کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے شیر کے گولی مار دی تو اس کی جان بچی ورنہ شیر نے اِس کو پھاڑ ہی کھایا ہوتا۔'' ہینسن اتنا کہہ کر رُک گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہینسن اِس طرح کھانسا جیسے کوئی ایسی بات کہنی چاہتا ہے

جسے ظاہر کرنا اُس کا فرض ہے مگر مناسب نہیں سمجھ رہا۔

"اور کیا کہنا چاہتے ہو؟" مریم کے منہ بولے باپ نے اس سے پوچھا۔ "کیا کوئی اور بات بھی ہے؟"

"جناب وہ بات یہ ہے۔" ہینسن نے بڑے ادب کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "کہ میں چونکہ شام کے وقت اکثر یہیں ہوتا ہوں اس لیے ان دونوں کو بہت دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ اور جناب میرا خیال یہ ہے کہ ماریسن کی نیّت نیک نہیں ہے۔ میں چھُپ کر اُن کی جتنی باتیں سُن سکا ہوں اُن سے اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ماریسن مریم کو اپنے ساتھ لے جانے کی فکر میں ہے۔"

وہ اپنے مطلب کے لیے جھوٹ بول رہا تھا مگر جو بات کہہ رہا تھا وہ سچّی تھی۔

کہنے لگا۔ "میں عنقریب روانہ ہونے کو ہوں۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہے کہ آپ ماریسن سے کہیں وہ میرے ساتھ چلا جائے۔ میں اُسے شمال

میں قافلے کے راستے تک پہنچا دوں گا۔"

مریم کا منہ بولا باپ ایک لمحے کسی سوچ میں ڈوبا کھڑا رہا، پھر ہینسن سے بولا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مسٹر ماریسن وطن واپس جانے کا ارادہ بھی کر رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ چلے جائیں تو یہ صورت مناسب رہے گی۔ تم کب روانہ ہو رہے ہو؟ کل؟ کل صُبح ہی یہاں آ جانا۔ اب تُم جاؤ۔ مریم کی جان بچانے کے لیے تمہارا شکریہ۔" مریم کا مُنہ بولا باپ مطالعے کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ماریسن منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے ماریسن سے کہا۔ "ہینسن کل یہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔ تُم بھی جانا چاہتے ہو۔ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ وہ کہہ بھی رہا تھا کہ مسٹر ماریسن کو میرے ساتھ کر دیجیے۔ میری صلاح یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ چلے ہی جاؤ۔ گڈ نائٹ۔"

مریم اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق ماریسن کے رخصت ہو جانے تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ گو اُسے یہ بات بہت ناگوار گُزری کہ

ماریسن کو کھڑے کھڑے نکال دیا گیا۔ اِسی لیے وہ اسے اپنے دل میں مظلوم بھی سمجھنے لگی۔

اُدھر جب ماریسن، ہینسن کے ساتھ سفر پر روانہ ہوا تو ہینسن نے اُسے بھڑکایا کہ اُس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ اُسے چاہیے کہ مریم کو وہاں سے نکال کر لے جائے اور اِس کی ترکیب یہ بتائی کہ وہ مریم کو پیغام بھیج کر بلائے۔ میں اپنے آدمی کے ہاتھ یہ پیغام مریم تک پہنچا دوں گا۔ وہ ضرور چلی آئے گی۔ ماریسن نے ہینسن کی یہ تجویز مان لی۔

کوراک پلٹ کر اُس جگہ جا پہنچا تھا جہاں اُس نے اس لڑکی کو دیکھا تھا جو مریم جیسی پھُرتی سے درخت پر چڑھ گئی تھی۔ وہ اُسے دِن کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا۔

اچانک اُسے گھُڑسواروں کی آوازیں سُنائی دیں جو اُسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ شاخوں میں سے دیکھنے لگا۔ اُن میں سے ایک تو وہی تھا جسِے اُس نے لڑکی کے پاس بیٹھے دیکھا تھا، دوسرا پہچاننے میں نہ آیا۔ گُو اس کی

صورت بھی پہلے کہیں دیکھی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

کوراک نے سوچا کہ اِن کے پیچھے لگ لینے سے وہ سفید لڑکی تک پہنچ جائے گا۔ وہ گھڑ سواروں کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ دونوں ہینسن کے کیمپ میں پہنچے۔ یہاں ماریسن نے مریم کے نام پیغام لکھا جو ایک آدمی کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ اُسے لے کر ہوا ہو گیا۔ مریم بنگلے کے باغ میں ٹہل رہی تھی کہ اس آدمی نے ماریسن کا لفافہ اُس کی طرف پھینک دیا۔ اُس نے لفافہ کھولا تو اُس میں سے ماریسن کا رقعہ نکلا۔ اس میں لکھا تھا۔

”میں تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔ کل صُبح سویرے اُس جگہ پہنچ جاؤ جہاں درخت نہیں ہیں۔“

جب ماریسن مریم سے ملنے کے لیے روانہ ہوا تو کوراک بھی درختوں درختوں اُس کے پیچھے لگ لیا۔ وہ ایک جگہ رُکا تو کوراک بھی ایک درخت پر اُس طرح لیٹ گیا کہ نیچے جو کچھ ہو وہ اُسے نظر آتا رہے۔

تھوڑی دیر بعد مریم آن پہنچی اور ماریسن اُس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ مریم

سے اپنی کوئی بات منوانی چاہ رہا تھا مگر مریم انکار کر رہی تھی۔ اِس کے ہاتھ ملانے اور سر جھٹکنے کا انداز بالکل مریم جیسا تھا۔

پھر باتیں ختم ہو گئیں۔ لڑکی واپس جانے کے لیے مُڑی۔ جنگل کے سِرے پر پہنچ کر اُس نے مُڑ کر چلّا کر کہا۔ ”اچھا، تو پھر آج رات کو۔“

اب کوراک نے پہلی مرتبہ لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک تیر نے اُس کے دِل کو چیر ڈالا ہے۔ اُس نے خود سے کہا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ مگر اُس کا کیا جواب تھا کہ اُس نے مریم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

کوراک نے اپنے نیزے کو تھپتھپایا اور چاقو کے دستے پر بھی ہاتھ پھیرا۔ مگر پھر ہتھیاروں پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ درخت پر بیٹھا بیٹھا کُچھ سوچ رہا تھا۔

ماریسن نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور شمال کی طرف چل نکلا۔ کوراک کا دِل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس کا پیچھا کر کے اُسے مار ڈالے مگر اچانک اُسے خیال آیا کہ مریم اُس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اگر یہ مر گیا تو اُس کو دُکھ

ہو گا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اس مرد کی حفاظت کرے گا۔ اُس کا دل جلن سے پھٹا جا رہا تھا مگر وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہا اور ماریسن، ہینسن کے کیمپ تک صحیح سلامت پہنچ گیا۔

کوراک قریب کے ایک درخت پر بیٹھا رہا۔ تیسرا پہر گزرا۔ پھر شام ہونے لگی مگر ماریسن کیمپ سے باہر نہ گیا۔ کوراک نے خیال کیا شاید مریم یہاں آئے گی۔ کُچھ دیر بعد ہینسن اپنے ایک آدمی کو ساتھ لے کر کیمپ سے روانہ ہو گیا۔ کوراک نے اُسے جاتے دیکھا تو خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے اُس شخص سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

رات ہو گئی مگر ماریسن اب بھی کیمپ سے باہر نہ نکلا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اپنے خیمے کے آگے ٹہلنے لگا۔ ایک طرف سے شیر کے کھانسنے کی آواز آئی تو وہ خیمے کے اندر گھُس کر بندوق نکال لایا۔ اُس نے ملازم کو حکم دیا کہ آگ میں اور جھاڑ جھنکار جھونک دے۔ وہ گھبرایا گھبرایا اور ڈرا نظر آ رہا تھا۔

ہینسن اس جگہ پہنچ گیا جہاں آنے کا مریم نے ماریسن سے وعدہ کیا تھا۔ نو بجے مریم آ گئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ جب اُس نے وہاں ماریسن کے بجائے یورپی تاجر کو دیکھا تو حیران ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔

ہینسن نے اُسے یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ مسٹر ماریسن کے پاؤں میں موچ آ گئی ہے، اِس لیے وہ نہیں آ سکے۔ اپنی جگہ مُجھے بھیج دیا ہے۔ مریم نے اُس کی بات کا یقین کر لیا اور اس کے ساتھ ہو لی۔

وہ تمام رات مغرب کی سمت چلتے رہے۔ صُبح کو ناشتے کے لیے ایک جگہ آٹھ گھنٹے کو رُکے اور پھر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کو پھر ایک جگہ آرام کرنے کے لیے وہ گھوڑوں پر سے اترے۔ مریم نے کہا۔ ”کیا کیمپ اتنی دُور ہے؟“

یورپی تاجر نے اُسے بتایا کہ وہ قافلے کو صُبح ہی کوچ کر دینے کا حکم دے آیا تھا۔ اِس لیے وہ آگے نکل گیا ہو گا۔ کل پکڑا جا سکے گا۔ مگر اِس رات اور اگلے دِن تمام وقت سفر کرتے رہنے کے بعد بھی قافلے کا کہیں نشان نظر

نہ آیا۔ مریم جنگل کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ اُس نے تاڑ لیا کہ اس راستے سے تو بہت دِن سے کوئی قافلہ گزرا ہی نہیں۔

اسے شک ہونے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ یورپی تاجر کا رویّہ بھی بدلنے لگا۔ مریم کو یقین ہو گیا کہ اِس مرد سے پہلے بھی کبھی کسی جگہ اس کا واسطہ پڑ چکا ہے۔ تاجر نے کئی دِن سے ڈاڑھی نہیں مونڈی تھی۔ اِس لیے اُس کے چہرے پر بال نکل آئے تھے۔ اُن کی وجہ سے مریم جو اس کا چہرہ جانا پہچانا معلوم ہونے لگا۔

اگلے دِن وہ بگڑ گئی۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور صاف کہہ دیا کہ آگے نہیں جاؤں گی۔ مگر ہینسن نے اُسے یقین دِلایا کہ اُس کا شک بے جا ہے۔ اب کیمپ صرف چند میل دُور رہ گیا ہے مگر مریم کو اِس کی بات کا یقین نہ آیا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ دِل ہی دِل میں بھاگ نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگی۔

وہ اس مرد کے چہرے کی طرف نظر بچا بچا کر دیکھتی رہی اور ذہن کو

کرید تی رہی کہ اسے پہلے کہاں دیکھا ہے؟

دوپہر کے بعد وہ جنگل سے نکل کر ایک چوڑے اور سُست رفتار دریا کے کنارے پر جا پہنچے۔ پرلے کنارے پر ایک کیمپ نظر آ رہا تھا۔ تاجر کے پُکارنے پر اُس کے حبشی ملازموں نے ایک بڑی سی کشتی پانی میں اُتار دی۔

"ماریسن کہاں ہے؟" مریم نے کپکپاتی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"وہاں" تاجر نے اُس خیمے کی طرف سے اشارہ کیا جو کیمپ کے بیچوں بیچ تھا، اور اسے ساتھ لے کر اس کی طرف بڑھا۔

جب وہ خیمے کے دروازے پر پہنچے تو تاجر نے اس کا پردہ اُٹھا کر مریم کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ مریم خیمے کے اندر داخل ہو گئی مگر وہ بالکل خالی تھا، سوائے ایک کھونٹے اور ایک زنجیر کے۔ مریم دہشت کھا کر ہینسن کی طرف مُڑی۔ اچانک وہ پہچان گئی کہ یہ مالبن ہے۔ وہی جس کے چنگل سے اُس اجنبی شکاری نے اُسے چھڑایا تھا۔

جب ہینسن ہنستا ہوا اُس کی طرف بڑھا تو مریم لرز اُٹھی کہ آج اُسے اِس ظالم سے کوئی نہ بچاسکے گا۔ اس کے دوست یہاں سے میلوں دُور ہیں۔ وہ مدد کو نہ آسکیں گے۔

ماریسن نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ وہ مریم اور ہینسن کے انتظار میں تمام وقت ٹہلتا رہا تھا۔ وہ اس دُبدا میں تھا کہ کہیں ہینسن پکڑا نہ گیا ہو۔ اگر ایسا ہو گیا ہو گا تو مریم کا منہ بولا باپ مجھے سزا دینے کے لیے ادھر آرہا ہو گا۔

جب مریم اور ہینسن صُبح تک بھی نہ پہنچے تو ماریسن کو یقین ہو گیا کہ وہ پکڑا گیا۔ اُس نے یہاں سے بھاگنے کا فیصلہ کر کے کیمپ کے ملازموں کو کُوچ کرنے کا حکم دے دیا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ قافلے سمیت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں دوپہر کے وقت ایک جگہ وہ لڑکا ملا جسے ہینسن اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مگر پھر جنگل میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ہینسن سفید عورت کو لے

کر چلا گیا ہے اور مغرب کی طرف دوسرے کیمپ کو گیا ہے جو دریا کے کنارے پر ہے۔

یہ سُن کر ماریسن کا غصّے کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ اُس نے لڑکے سے کہا کہ اُسے دوسرے کیمپ تک پہنچا دے اور فوراً اُسے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ راستے میں بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوا۔ کہیں راستہ خراب ہونے کی وجہ سے پیدل چلنا پڑا، کہیں خار دار جھاڑیوں سے گزرتے میں وہ اور لڑکا دونوں، لہولہان ہو گئے۔ کہیں بھبکتی ہوئی دلدلیں پار کرنی پڑیں، جِن میں سانپ اور مگر مَچھ بھرے پڑے تھے مگر ماریسن بڑھا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ دریا آ گیا جس کے پرلے کنارے پر ہینسن کا کیمپ نظر آ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر کیمپ کے آدمی آوازیں دینے لگے۔ اتنے میں ماریسن نے ایک کشتی پکڑ لی اور لکڑی کے دو ٹکڑوں کو چپّو کی طرح چلا کر اُسے کھینا شروع کر دیا۔

ہینسن اپنے آدمیوں کے چیخنے پر جلدی سے خیمے سے باہر نکلا اور جب ماریسن کو اُدھر سے آتے دیکھا تو دریا کے کنارے پر پہنچ کر چلّا کر اُس سے

پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

ماریسن چلّایا۔ ”بدمعاش، دغا باز۔“ اور پستول نکال کر ہینسن پر فائر کر دیا۔

اِدھر سے ہینسن نے دو فائر کیے۔ ایک گولی سے لڑکا مر کر دریا میں گِر گیا۔ دوسری گولی ماریسن کے کان کے پاس سے نکل گئی۔ وہ فوراً دُہرا ہو کر کشتی میں گِر پڑا اور ایک لمحے بے حرکت پڑا رہا۔ پھر اُس نے ہینسن پر پستول تانا۔ ہینسن اُس کی گولی سے بچ نہ سکا۔ وہ زخمی ہو کر مُنہ کے بل گِرا مگر ابھی اُس میں فائر کرنے کی سکت تھی۔ اُس کی گولی سے ماریسن زخمی ہو کر گِرا۔ پھر بھی زور لگا کر جوں توں اُٹھ گیا اور ہینسن پر فائر کر کے اُسے گِرا دیا۔ مگر ہینسن میں ابھی لڑنے کا دم باقی تھا۔ اُس نے پھر فائر کیا۔ کشتی کے کنارے کی ایک چپٹی اُڑ کر پانی میں جا گِری۔ ماریسن نے بھی گولی چلائی۔ ہینسن ایک بار پھر زخمی ہوا۔ اب وہ اِس قابل بھی نہ رہا کہ کنارے سے ہٹ سکتا۔ ماریسن بھی اُٹھ سکنے کے ناقابل ہو گیا تھا۔ وہ کشتی

ہی میں پڑا رہا۔ کشتی بہتے بہتے دریا کا موڑ مُڑ گئی۔ یوں یہ جنگ ختم ہو گئی۔

مریم، جو خیمے کے اندر کھونٹے سے بندھی پڑی تھی گولیاں چلنے کے آوازیں تو سُن رہی تھی مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنا تو ظاہر تھا کہ کوئی مالبن سے لڑ رہا ہے مگر یہ نہ کھلتا تھا کہ کون ہے۔ کیا وہ اس کا مُنہ بولا باپ ہے یا کوراک؟ اتّفاق سے مالبن جب خیمے سے باہر نکلا تھا تو جلدی میں مریم کے پٹّے کا تالا لگانا بھول گیا تھا۔ مریم ہلی جُلی تو پٹّا کھل گیا۔ قریب ہی مالبن کا پستول پڑا تھا۔ مریم نے اُسے اُٹھا لیا اور خیمے سے باہر نکلی۔ وہاں سب مالبن کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جو اوندھا پڑا تھا۔ مریم نے دریا کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ اُس نے پستول کو دیکھا بھالا۔ اُس میں گولیاں نہیں تھیں۔ اُس نے کیس کھولا۔ اُس میں گولیاں تھیں۔ اُس نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے پستول بھر لیا۔

اچانک اُس کی نظر اُس فوٹو پر پڑی، جو اِن خطوں کے بنڈل میں سب سے اوپر رکھا تھا جو گولیوں کے کیس میں پڑا ہوا تھا۔ وہ رُک کر اُسے دیکھنے لگی۔

یہ اُس کے بچپن کا فوٹو تھا۔ اُس نے فوٹو بنڈل میں سے نکال لیا۔ یہ کسی اخبار کا تراشا تھا۔ کاغذ پرانا ہونے کی وجہ سے زرد پڑ چکا تھا مگر اُس پر چھپی ہوئی تصویر بالکل صاف تھی۔ اُس کے پیچھے کچھ لفظ بھی چھپے ہوئے تھے مگر مریم اُن کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ وہ فرانسیسی زبان کے لفظ تھے جو مریم کو نہ آتی تھی۔

باہر کھٹکا سُن کر اُس نے کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا اور ایک بار پھر خیمے سے باہر نکلی۔ قریب ہی ایک درخت کی شاخ جھُکی ہوئی تھی۔ مریم نے اُچھل کر شاخ پکڑی اور وہ خاردار جھاڑی پھلانگ گئی جس کی خیمے کے گرد باڑھ کھڑی تھی۔

وہ پہلے تو جنگل کی طرف جانے لگی پھر سوچا کہ میرے دوست تو دریا پار کے علاقے میں ہیں۔ مغرب کی سمت جانے سے کیا فائدہ، دریا پار کر کے اُن تک پہنچنا چاہیے۔

کچھ فاصلے پر کشتیاں نظر آئیں۔ مریم جان ہتھیلی پر رکھ کر اُن کی طرف

دوڑی۔ اتّفاق سے اُس پر کسی کی بھی نظر نہ پڑی۔ اُس نے ایک کشتی کو پانی میں اتار کر اُسے کھینا شروع کر دیا۔ جب وہ بیچ دریا میں پہنچ گئی تو اس وقت چند بچّوں کی اُس پر نظر پڑی، مگر وہ صرف اشارے کر کے چِلاّتے رہے۔ اِس کے علاوہ اور کُچھ نہ کیا۔ جب وہ کنارے پر پہنچی تو سامنے ایک ویران گاؤں نظر آیا۔ وہ اُس میں سے گزرنے کے لیے دوڑنے لگی۔ مگر گاؤں اصل میں ویران نہیں تھا۔ اُس کے باشندے گھروں کے اندر چھُپ گئے تھے۔ اُسے دیکھ کر وہ سب باہر نکل آئے اور اُسے پکڑ لیا۔ اُن میں وہ سردار بھی تھا جس نے پہلے اُسے قید کر رکھا تھا اور خود کو اُس کا باپ ظاہر کرتا تھا۔

سردار نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو پھر آ گئی؟“

”مجھے چھوڑ دو۔“ مریم گڑگڑائی۔ ”مجھے جانے دو۔ میں بڑے صاحب کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“ اِس جنگل میں حبشی مریم کے منہ بولے باپ کو بڑا صاحب کہتے تھے۔

"بڑے صاحب کے پاس؟" سردار نے پوچھا۔ "تو کیا تُو اب تک اُسی کے پاس تھی؟ کیا وہی تُجھ کو مجھ سے چھین کر لے گیا تھا؟"

مریم نے حوصلہ کر کے کہا۔ "بڑے صاحب میرے دوست ہیں۔ وہ مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ اگر تُم نے مُجھے کُچھ کہا تو وہ تمہیں جان سے مار دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسی۔

مریم کا یہ منتر کام کر گیا۔ سردار اگر کسی سے ڈرتا تھا تو وہ بڑا صاحب تھا۔ اُس نے فوراً اپنے لشکر سمیت وہاں سے کُوچ کر دیا۔

دریا پار سے مالبن کے ملازم یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب سردار اور اُس کے آدمی اُن کی نظروں سے اوجھل ہوئے تو انہوں نے مالبن کے پاس جا کر اسے سارا ماجرا سنا دیا۔

# پُر اسرار فوٹو

دو دِن کے سفر کے بعد سردار اپنے گاؤں میں پہنچ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں مریم کا بچپن کا زمانہ گزرا تھا۔ اُسے، پہلے کی طرح اب بھی، گاؤں میں چلنے پھرنے کی اجازت دے دی گئی کیوں کہ گاؤں کے گرد جو باڑھ لگائی گئی تھی وہ کافی اونچی اور مضبوط تھی اور دروازوں پر دِن رات پہرہ رہتا تھا۔

مریم گاؤں کے ایک ایسے گوشے میں جا بیٹھی جہاں تنہا تھی۔ وہیں وہ

درخت بھی تھا جس کے تلے وہ اکثر کھیلا کرتی تھی۔ مگر اب وہ درخت کٹ چکا تھا۔ وہ وجہ سمجھ گئی۔ کوراک نے اُسی درخت سے گاؤں کے اندر اُتر کر اُسے ظالم کے پنجے سے چھڑایا تھا۔

اچانک مریم کو وہ کاغذ یاد آیا جو اُس نے اپنی جیب میں رکھ چھوڑا تھا۔ اُس نے کاغذ نکالا اور اپنے بچپن کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کے جسم پر ایک گوری لڑکی جیسا لباس تھا۔ اور گلے میں ایک زنجیر پڑی ہوئی تھی جس میں ایک لاکٹ لٹک رہا تھا۔ اُس کے دل میں فوراً یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا یہ پھول سی لڑکی افریقہ کے ایک سردار کی بیٹی ہو سکتی ہے؟ یہ بات ناممکن ہے۔ مگر پھر بھی یہ لاکٹ کیسا ہے؟ مریم اُس کو پہچانتی تھی۔ اُس نے یہ لاکٹ پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ اُسی کا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ میری پچھلی زندگی میں کیا بھید ہے جو مجھ پر نہیں کھُلتا۔

یکایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ کمرے میں کوئی اور بھی ہے جو اُس کے عین پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے فوراً تصویر جیب میں واپس رکھ لی۔

اُدھر کسی شخص نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ سمجھی سردار ہے اور اُس کے تھپّڑ کا انتظار کرنے لگی جو اُس کے بعد پڑنا تھا۔ جب وہ تھپّڑ نہ پڑا تو اُس نے مُڑ کر اوپر نظر کی۔ اُس کے سامنے ایک کامک کھڑا تھا۔ یہ نوجوان مریم کے گاؤں سے جانے کے بعد وہاں آیا تھا۔

اس نے مریم سے کہا۔ "ذرا یہ تصویر ہمیں بھی تو دکھاؤ۔"

مریم پرے ہٹ گئی۔

وہ کہنے لگا۔ "واپس کر دوں گا۔ میں تمہارا ذکر سُن چکا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کو سردار سے نفرت ہے۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ میں تمہارا بھید کسی اور پر ظاہر نہیں کروں گا۔ ذرا یہ تصویر دکھاؤ تو سہی۔"

مریم نے سوچا، میں دُشمنوں میں گھِری ہوں۔ یہاں میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ شاید یہ نوجوان میرا مدد گار بن جائے۔ اُس نے تصویر اُس کے حوالے کر دی۔

کامک اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہے تو تمہاری ہی مگر یہ اُتاری کہاں گئی تھی؟“

”کیا خبر۔“ مریم نے جواب میں کہا۔ ”مجھے تو دو دِن پہلے مالبن کے خیمے میں ملی تھی۔“

کامک کی نظر اِس عبارت پر پڑی جو تصویر کے نیچے درج تھی۔ وہ فرانسیسی زبان میں شُدھ بُدھ رکھتا تھا۔ عبارت کو اٹک اٹک کر پڑھنے لگا۔ جوں جوں پڑھتا گیا اُس کی آنکھیں سکڑتی گئیں۔ جب عبارت ختم ہوئی تو مریم سے پوچھنے لگا۔ ”تم نے یہ عبارت پڑھی ہے؟“

مریم بولی۔ ”یہ فرانسیسی زبان میں ہے۔ میں فرانسیسی نہیں جانتی۔“ کامک خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُسے اچانک ایک ترکیب سوجھی۔ کہنے لگا۔ ”مریم، تم مجھے نہیں جانتیں۔ میرا باپ صحرائے اعظم میں ایک علاقے کا سردار ہے۔ تُم میرے ساتھ چلی چلو، مجھے بھی اُس سردار سے نفرت ہے۔“

”تجھے سردار سے نفرت ہے؟“ پیچھے سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔
”اور تصویر کیا ہے؟“

ان سے چند قدم پرے سردار کھڑا تھا۔ تصویر ابھی تک کامک ہی کے پاس تھی۔ اُس نے اُسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں مجھے تم سے نفرت ہے۔“ اور اچھل کر سردار کے اتنی زور سے گھونسا مارا کہ وہ زمین پر گِر پڑا۔ پھر دوڑ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور گاؤں کے ایک دروازے کی طرف لپکا۔ سردار لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور اپنے آدمیوں کو آوازیں دینے لگا کہ کامک کو روکو۔ ایک درجن آدمی اسے پکڑنے دوڑے مگر اُس نے کسی کو دھکّا دے کر پرے ہٹا دیا، کسی کو روند ڈالا، اور صاف نکل گیا۔

سردار نے غصّے سے بے قابو ہو کر حکم دے دیا کہ اُس کا پیچھا کیا جائے۔ پھر وہ مریم پر چیخا۔ ”وہ تصویر کہاں ہے؟ لا مجھے دے۔“

مریم نے کہا۔ ”تصویر تو وہ لے گیا۔“

سردار نے مریم کے سر کے بال پکڑ کر اُسے کھڑا کیا۔ اور پوچھنے لگا۔ ”وہ کاہے کی تصویر تھی؟“

”میری تصویر تھی۔“ مریم بولی۔ ”میرے بچپن کی تھی۔ میں نے مالبن کے ہاں سے چُرائی تھی۔ وہ کسی اخبار کے ایک ٹکڑے پر تھی۔ اُس کے نیچے کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔“

”کیا لکھا ہوا تھا؟“ سردار کے غصّے کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

”مجھے کیا خبر!“ مریم نے جواب دیا۔ ”جو کچھ لکھا تھا وہ فرانسیسی زبان میں تھا۔ میں یہ زبان نہیں جانتی۔“ سردار کی تسلّی ہو گئی۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔

ادھر کا مک قافلے کے راستے پر بگٹٹ گھوڑا دوڑائے چلا جا رہا تھا۔

# ہاتھی کا انتقام

ماریسن کشتی میں بے ہوش پڑا تھا اور کشتی دریا میں بہتی چلی جارہی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔ وہ بڑی دیر تک پڑا رہا۔ اور یہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ کچھ دیر بعد اُسے یاد آگیا کہ وہ ایک کشتی میں پڑا ہے، اکیلا ہے، زخمی ہے اور راستہ گُم کر بیٹھا ہے۔

وہ بڑی مُشکل سے اُٹھ کر بیٹھا۔ زخموں پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ اب اُن

سے خون نہیں رِس رہا ہے۔ وہ گھٹنے ٹیک کر ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو چپّو بنا کر کشتی کھینے لگا۔ رفتہ رفتہ کشتی ساحل کے قریب پہنچنے لگی۔ ماریسن کے کانوں میں شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔

وہ اتنی قریب تھی جیسے شیر ساحل ہی پر ہے۔ ماریسن نے بندوق اُٹھا کر پاس رکھ لی مگر کشتی کو برابر کھیتا رہا۔

پھر اُس نے درخت کی شاخوں کے کشتی سے رگڑ کھانے کی آواز سُنی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر درخت کا ایک تنا پکڑ لیا۔ شیر ایک بار پھر دھاڑا۔ اب کے وہ اور بھی قریب معلوم ہو رہا تھا۔ ماریسن نے سوچا، کہیں یہ کم بخت میرا انتظار تو نہیں دیکھ رہا کہ میں کب خشکی پر اُترتا ہوں۔

اس نے تنے پر زور ڈال کر دیکھا کہ کتنا مضبوط ہے۔ اس پر دو درجن آدمی لٹک سکتے تھے۔ اُس نے جھک کر اپنی بندوق اٹھائی اور کندھے پر لٹکا لی۔ پھر تنے کو پکڑ کر خود کو اوپر کی طرف کھینچنا شروع کیا، یہاں تک کہ کشتی سے بالکل اوپر اٹھ گیا اور وہ اس کے تلے سے نکل کر بہ گئی۔ اب اس نے

درخت کے تنے پر چڑھنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی کیونکہ اس میں چڑھ سکنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ کچھ دیر تک وہ ادھر لٹکا رہا۔ اس کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اب جیسے تیسے درخت پر چڑھنا چاہیے ورنہ قصّہ ختم ہے۔

اچانک شیر کی گرج اتنے قریب سے سنائی دی جیسے وہ اس کے کانوں میں گر جا ہے۔ اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ شیر اس سے ذرا اوپر لال لال دیدے نکالے کھڑا ہے۔

ماریسن نے سوچا، شیر درخت پر نہیں چڑھ سکتا اس لیے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر اگلے لمحے ایک اور آفت ٹوٹی۔ نیچے دریا میں، ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ پھر کوئی چیز اس کے پاؤں سے ٹکرائی اور اگلے لمحے مگر مچھ کے جبڑے کھٹ سے بند ہوئے مگر وہ ماریسن کی ٹانگ نہ لے سکا۔

"اس کمبخت نے تو مار ہی لیا تھا۔" یہ کہہ کر ماریسن نے درخت پر چڑھنے کی ایک بار پھر کوشش کی مگر دل میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوشش پروان نہ چڑھے

گی۔ اس کی بے جان اور سُن انگلیاں درخت کے تنے پر سے پھسلنے لگیں وہ دریا میں گرنے کو ہوا۔ اچانک اوپر پتّوں کی کھڑ کھڑاہٹ ہوئی، جیسے کوئی حرکت کر رہا ہے۔ ماریسن جس تنے کو پکڑے لٹک رہا تھا اس پر اور دباؤ پڑا۔ پھر کسی نے اسے پکڑ کر اوپر درخت کی شاخوں میں کھینچ لیا۔

یہ کوراک تھا، جو ہاتھی پر بیٹھا، اس دریا تک آ پہنچا تھا اور اس وقت دریا کے کنارے ایک درخت کے تنے پر سکڑا سکڑا یا پڑا تھا۔ اس کی آنکھ لگ گئی تھی مگر شیر کی گرج سے جاگ گیا۔ اگلے لمحے اسے اپنے عین نیچے دریا میں مگرمچھ کے جبڑے کھٹ سے بند ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر ماریسن کی آواز آئی جسے وہ پہچانتا تھا۔ کوراک نے اپنا ہاتھ نیچے کی طرف بڑھا کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ ماریسن یہ سمجھا کہ وہ کسی گوریلے کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ وہ پستول نکالنے لگا۔ اتنے میں کسی نے انگریزی زبان میں پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

ماریسن اتنا بھونچکا ہوا کہ اگر سنبھل نہ جاتا تو نیچے گر پڑا ہوتا۔ اس نے

حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تُم انسان ہو؟“

”اور نہیں تو کیا ہوں؟“ کوراک نے سوال کیا۔

”گوریلا۔“ ماریسن نے جواب میں کہا۔

کوراک ہنس دیا۔ پھر پوچھنے لگا۔ ”تُم کون ہو؟“

ماریسن بولا۔ ”میں ایک انگریز ہوں۔ میرا نام ماریسن ہے۔ مگر تم کون بلا ہو؟“

کوراک نے کہا۔ ”مجھے کوراک کہتے ہیں۔ تم وہی آدمی ہو نا جسے میں نے اُس وقت ایک لڑکی سے باتیں کرتے دیکھا تھا جب وہاں میدان میں شیر نے حملہ کیا تھا۔“

”ہاں“ ماریسن بولا۔ ”میں وہی آدمی ہوں۔ اُس لڑکی کو چُرا لیا گیا ہے۔ میں اُسے ڈھونڈ رہا ہوں تا کہ دُشمن کے پنجے سے چھڑاؤں۔“

”چُرا لیا گیا ہے؟“ کوراک نے ماریسن کے الفاظ دُہرائے۔ اُس پر یہ سُن کر

بجلی سی گر پڑی تھی۔ "اسے کِس نے چُرایا ہے؟"

"یورپی تاجر، ہینسن نے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

ماریسن نے اُسے سب حال سُنا دیا۔ اتنے میں صُبح ہونے لگی۔ کوراک یہ کہہ کر جانے لگا کہ میں اُس لڑکی کو لا کر تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ مگر ماریسن نے ضد کی کہ میں بھی چلوں گا اور جب کوراک راضی نہ ہوا تو بولا۔ "میرا فرض ہے کہ اُسے بچاؤں۔ وہ میری دلہن بننے والی تھی۔" کوراک نے نرمی سے کہا۔ "تم زخمی ہو۔ سفر نہ کر سکو گے۔ میں تم سے زیادہ تیز رفتار سے موقع پر پہنچ جاؤں گا۔"

ماریسن بولا۔ "تم آگے آگے جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔"

"اچھا تمہاری مرضی یہی ہے تو آجاؤ۔" یہ کہہ کر کوراک تیز چال سے جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ماریسن بھی تھکی تھکی چال

سے چلتے ہوئے اسی سمت میں چلنے لگا۔

راستے میں ماریسن کی مُڈ بھیڑ سردار کے اُن آدمیوں سے ہو گئی جو کامک کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ اُسے باندھ کر اپنے سردار کے پاس لے گئے۔

ادھر کوراک نے اپنے دوست ہاتھی پر بیٹھ کر دریا پار کیا اور مالبن کے کیمپ میں گھُس گیا۔ مالبن کے ملازم چیخیں مارتے ہوئے بھاگنے لگے۔ مالبن نے دیکھا کہ ہاتھی اُس پر چڑھا چلا آ رہا ہے تو اس کی بھی دہشت کے مارے جان نکلنے لگی۔ پھر ہاتھی اُس سے چند قدم پرے رُکا اور کوراک زمین پر اترا۔ مالبن نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اُس کا خوف سے دم فنا ہونے لگا۔ کوراک نے انگریزی زبان میں پوچھا۔ ”سفید لڑکی کہاں ہے؟“

”کون سی سفید لڑکی؟“ مالبن بولا۔ ”یہاں کوئی سفید لڑکی نہیں ہے۔“

”جھوٹ نہ بولو۔“ کوراک نے اُسے ڈانٹا۔ ”تم اُسے چُرا کر لائے ہو۔ وہ تمہارے پاس ہے۔ بتاؤ کہاں ہے وہ؟“

مالبن کوراک کے چہرے پر غصّہ دیکھ کر ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ ”اگر تم مجھے کُچھ نہ کہو تو میں تمہیں سب حال سُنادوں۔“

کوراک نے سر ہلا دیا۔ مالبن نے بتایا۔ ”یہ ماریسن تھا جو اُس لڑکی کو بہلا پھُسلا کر لایا تھا۔ اُس نے لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ اُس سے شادی کر لے گا۔ ماریسن کو معلوم نہیں ہے کہ وہ لڑکی کون ہے مگر مجھے معلوم ہے۔ جو کوئی اُسے اُس کے وارثوں کے پاس پہنچائے گا اُسے بڑا بھاری انعام ملے گا۔ میں نے اس پر صرف اس لیے قبضہ کیا تھا کہ وہ انعام حاصل کر سکوں۔ مگر وہ یہاں سے بھاگ نکلی اور میری ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر گئی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا مگر دریا پار کے ایک غیر آباد گاؤں میں سردار موجود تھا۔ خبر نہیں وہاں کس طرح آن مرا تھا۔ وہ اُسے پکڑ کر لے گیا۔ اُس کے آدمیوں نے مُجھے آگے نہ بڑھنے دیا۔ یوں سفید لڑکی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ اگر تُم اُس کی تلاش میں ہو تو سردار کو جا پکڑو اور اُس سے چھین لو۔ وہ جھوٹ موٹ یہ کہتا رہا ہے کہ یہ میری بیٹی ہے۔“

"تو پھر وہ لڑکی کون ہے؟" کوراک نے پوچھا۔

مالبن کہنے لگا۔ "اگر تُم اسے سردار سے چھین لاؤ اور مُجھ سے وعدہ کرو کہ مُجھے جان سے نہیں مارو گے اور انعام میں سے آدھی رقم بھی دو گے تب بتاؤں گا۔ اگر تم نے مُجھے مار ڈالا تو پھر یہ راز تم کو کبھی معلوم نہ ہو گا۔ میرے علاوہ صرف کالا سردار یہ راز جانتا ہے۔ وہ تُم کو ہرگز ہرگز نہ بتائے گا۔ خود لڑکی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ وہ کِس کی بیٹی ہے۔"

کوراک بولا۔ "اگر تُم نے مُجھ سے سچ بولا ہے تو میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ اب میں سردار کے گاؤں جاتا ہوں۔ اگر سفید لڑکی وہاں نہ ملی تو واپس آکر تُم کو جان سے مار ڈالوں گا۔ رہی راز کی بات، سو اگر لڑکی نے وہ راز معلوم کرنا چاہا تو میں تُم سے کسی نہ کسی طرح اُگلوا ہی لوں گا۔" یہ کہہ کر کوراک تو مالبن کے خیمے کے اندر تلاشی لینے کے لیے گھُس گیا، اِدھر ہاتھی نے مالبن کو پہچان لیا کہ اِسی آدمی نے اُس کی مادہ کو برسوں پہلے ہلاک کیا تھا اور اُسے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اِس طرح پٹخا کہ اُس کی ہڈّی پسلی ایک ہو گئی۔

# آخری معرکہ

کالا سردار ماریسن کو قہر کی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ ”تم میرے علاقے میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

ماریسن نے جواب دیا۔ ”مُجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ علاقہ تمہارا ہے۔ جب تمہارے آدمیوں نے مُجھے پکڑا، اُس وقت میں ایک سفید لڑکی کو تلاش کر رہا تھا۔“

سردار نے مُسکراتے ہوئے گاؤں کی باڑھ کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ تو

نہیں؟"

ماریسن نے اُدھر دیکھا تو مریم بیٹھی نظر آئی۔ وہ چلّایا۔ "مریم۔"

مریم نے مُڑ کر دیکھا۔ ماریسن اُس کی طرف چلا مگر سردار کے آدمیوں نے پکڑ کر روک لیا۔

سردار نے اُس سے پوچھا۔ "تم کو میری بیٹی سے کیا کام ہے؟"

ماریسن حیران رہ گیا۔ "وہ تمہاری بیٹی ہے"!

سردار سمجھ گیا کہ مریم کی اصلیت کے بارے میں اِس سفید آدمی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ اب اُسے ماریسن سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اُس نے سوچا۔ اِس کا معاملہ آئندہ پر اُٹھا رکھنا چاہیے۔ شاید اِس کے بدلے روپیہ ملے۔ اُس نے ماریسن کے ہاتھ پاؤں بندھوا کر ایک جھونپڑی میں ڈلوا دیا اور اُس پر پہرا لگوا دیا۔

ماریسن نے اپنے بندھن کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ پھر اُسے

خیال آیا کہ اگر میں کسی ترکیب سے مریم کو بُلا لوں تو وہ بندھن کھول دے گی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کئی آوازیں سُنائی دیں جن میں سے ایک مریم کی آواز تھی۔ ماریسن اُسے سُنانے کے لیے زور زور سے گانے لگا۔ جواب میں مریم کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "خدا حافظ، میں کل صُبح تک مر چکی ہوں گی۔"

پھر ایک مرد کے غصّے سے کچھ کہنے کی آواز سُنائی دی۔ ماریسن نے بندھن کھولنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اگلے لمحے ایک ہاتھ آزاد ہو گیا۔ اُس ہاتھ سے اُس نے دوسرے ہاتھ کے بندھن بھی کھول لیے۔ پھر اُس نے پاؤں کی رسّیاں کھول لیں اور دروازے کی طرف دوڑا مگر باہر نکلا تو ایک بھاری بھرکم کالے آدمی نے راستہ روک لیا۔

سردار کے گاؤں تک پہنچ جانے کے بعد کوراک ہاتھی سے اُتر کر درختوں پر چڑھ گیا۔ اب وہ درخت نہیں تھا جس سے کوراک پچھلی مرتبہ اندر اترا تھا، مگر وہ کب رُکتا تھا۔ اُس نے رسّی کمر سے کھول کر اُس کا پھندہ باڑھ کے

ایک کھمبے پر ڈال کر کسا اور اُس کی مدد سے گاؤں کے اندر کود گیا۔ اُسے پرلے سِرے سے مریم کی آواز آئی۔ وہ فوراً اُس کی طرف لپکا۔

سردار نے مریم کو بُلا کر ایک بوڑھے اور بھیانک مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب زیادہ عرصے زندہ نہ رہوں گا۔ اِس لیے تم کو اپنے سوتیلے بھائی 'کادن' کے حوالے کرتا ہوں۔“

اُس کی بات ختم ہوتے ہی کادن اُٹھا اور مریم کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بوڑھا اور شکل کا بھیانک ہی نہیں تھا بلکہ ایک بیماری کی وجہ سے اُس کے ایک کلّے کا کچھ حصّہ اور ناک بھی گل گئی تھی۔

مریم ڈر کر پیچھے ہٹنے لگی۔ کادن نے اُس کی بانہہ پکڑ لی اور کہا۔ ”چل۔“ مگر مریم اپنے آپ کو چھڑانے لگی۔ کادن اُسے گھسیٹتا ہوا سردار کے خیمے سے باہر لایا اور پھر اپنے خیمے کے اندر لے گیا۔ مریم نے زور لگا کر خود کو چھڑا لیا مگر کادن نے پھر پکڑ لیا۔ یہ وہ موقع تھا جب اُس نے ماریسن کے گانے کی

آواز سُنی۔ جب اُس نے ماریسن سے انگریزی زبان میں بات کی تو کادن اُسے گھسیٹ کر خیمے کے پچھلے حصّے میں لے گیا۔

ماریسن نے دیکھا کہ پہرے دار راستہ روک رہا ہے تو اُس پر جا پڑا۔ پہرے دار زمین پر آ رہا۔ ماریسن نے اُس کا گلا دبانا شروع کر دیا مگر اُس نے چاقو نکال کر ماریسن پر لگاتار وار کر ڈالے۔ ماریسن نے ایک پتھّر اُٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ پہرے دار بے جان ہو کر رہ گیا۔ ماریسن اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس خیمے کی طرف دوڑا جس میں سے مریم کی آواز آئی تھی۔

کادن نے مریم کو خیمے کے پچھلے حصّے میں دھکیلا ہی تھا کہ کوراک چاقو سے خیمے کی دیوار پھاڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ مریم کا دل اُسے دیکھتے ہی اُچھلا اور وہ چلّا اُٹھی۔ ”کوراک۔“

کوراک کے مُنہ سے بھی نکلا۔ ”مریم“ اور وہ کادن پر جا پڑا اور دو چار مکّوں ہی میں اُسے ڈھیر کر دیا۔

اب کوراک مریم کی طرف مڑا۔ اُسی لمحے ایک شخص جو خون میں لتھڑا ہوا

تھا، خیمے کے اندر گھُسا۔

"ماریسن۔" مریم چلّا اُٹھی۔

اتنے میں باہر سے لوگوں کے بھاگ کر خیمے کی طرف آنے کی آوازیں سُنائی دینے لگی تھیں۔ کوراک نے ماریسن سے کہا۔ "یہ لو میری رسّی۔ اِس کی مدد سے باڑھ کی دیوار پھاندو اور مریم کو لے کر بھاگ جاؤ۔"

"اور تم؟" مریم نے پوچھا۔ "میں یہیں رہوں گا۔ مجھے سردار سے حساب چُکتا کرنا ہے۔"

مریم رُکنے لگی مگر کوراک نے اُسے اور ماریسن کو کندھے سے پکڑ کر خیمے کے باہر دھکیل دیا اور کہا۔ "سر پر پاؤں رکھ کر بھاگو۔" اور خود اُن آدمیوں کا مُقابلہ کرنے کے لیے مُڑا جو خیمے کے اندر گھُس رہے تھے۔

وہ ان سے بڑی بہادری سے لڑا مگر اُس کے لیے لڑائی جیت سکنا اس لیے مشکل تھا کہ دُشمن تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ البتّہ اِس سے ماریسن اور

مریم کو نکل جانے کا موقع مل گیا۔ جب کوراک ہار گیا تو دُشمنوں نے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور لے جا کر سردار کے سامنے ڈال دیا۔ وہ بڑی دیر خاموش بیٹھا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ اُسے زیادہ سے زیادہ کڑی سزا کون سی دے۔

اتنے میں گاؤں کے باہر جنگل کی طرف سے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز سُنائی دی۔ کوراک کے لبوں پر مُسکراہٹ آئی اور اُس نے اپنے منہ سے ایک پُراسرار آواز نکالی۔ سردار اور اُس کے آدمیوں میں سے کوئی اِس آواز کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

اُدھر، جنگل میں کوراک کے دوست ہاتھی 'ٹنیٹر' نے کوراک کی آواز سُن کر اپنے بڑے بڑے کان کھڑے کیے، پھر گاؤں کی باڑھ کے قریب پہنچ کر اپنی سونڈ اُٹھا کر سُوں سُوں کر کے سونگھا۔ اُس نے باڑھ کی لکڑیوں کو اپنے سر سے دھکیلا مگر باڑھ بہت مضبوط بنی ہوئی تھی، ٹوٹی نہیں۔

اِدھر سردار نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "اِسے زندہ جلا دو۔ اور یہ کام فوراً

ہو جانا چاہیے۔"

حبشی کوراک کو گھسیٹتے ہوئے گاؤں کے بیچ کی کھُلی جگہ میں لے گئے اور ایک کھونٹے سے باندھ دیا۔ پھر جھاڑ جھنکاڑ لا لا کر اُس کے گرد جمانے لگے۔ سردار وہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کوراک کو اپنے سامنے مروانا چاہتا تھا۔ اُس کے آدمیوں نے جھاڑ جھنکاڑ کو آگ دکھا دی۔ اُس میں سے شعلے اُٹھنے لگے۔ اُس پر کوراک نے وہی پُراسرار آواز ایک بار پھِر نکالی۔ جواب میں گاؤں کے باہر کی طرف سے پھر ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز سُنائی دی۔

ٹنیٹر نے باڑھ کی لکڑیوں اور بَلّیوں کو ایک بار پھر دھکّا مار کر گِرانا چاہا مگر ناکام رہا۔ اِس پر اُسے غصّہ آ گیا۔ وہ دس بارہ قدم پیچھے ہٹا اور باڑھ پر اتنے زور سے ٹکّر ماری کہ وہ چڑڑ چڑڑ کر کے ٹوٹ گری۔

آگ کے شعلے کوراک کی طرف بڑھتے جا رہے تھے کہ ایک حبشی نے مُڑ کر دیکھا تو اُسے ہاتھی اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ وہ چیخ مار کر بھاگا۔ اگلے لمحے

ہاتھی نے حبشیوں پر حملہ کر دیا۔ کسی کو اُٹھا کر اِدھر پھینکا کسی کو اُدھر پھینکا۔ اور شعلوں سے گُزر کر اپنے پیارے ساتھی کی طرف بڑھا۔ سردار بندوق لانے کے لیے اپنے خیمے کی طرف بھاگ گیا۔

ٹنیٹر نے کوراک کے جسم کے گرد اپنی سونڈ لپیٹی، پھر کھونٹے کو جھٹکا دے کر اکھیڑا اور اُس کے بعد باڑھ کی طرف بھاگا۔ سردار بندوق لیے ہوئے خیمے سے نکلا تو ہاتھی کے راستے میں آ گیا، جو غصّے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ بندوق تانتا ہی رہ گیا، ہاتھی نے اُسے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا اور پھر جنگل کے اندر گھُس گیا۔

مریم، کوراک کے کہنے پر ماریسن کے ساتھ چلی تو گئی تھی مگر جب اسے خیال آیا کہ کوراک اتنے سارے دُشمنوں سے اکیلا لڑ رہا ہے تو اُس نے ماریسن سے کہا۔ ”تم چلے جاؤ۔ میں تو یہیں رہوں گی۔“

ماریسن نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اُس بہادر انسان کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

"تو پھر آؤ۔" مریم اُلٹے قدموں واپس ہونے لگی۔ "ہم دونوں چل کر اُس کی مدد کریں۔" وہ گاؤں کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ کوراک کو زندہ جلایا جارہا ہے۔ ماریسن، مریم کو ایک طرف ہٹا کر کوراک کی طرف لپکنے کو تھا کہ عین اُسی لمحے ٹنیٹر نے باڑھ توڑ کر کالے آدمیوں پر حملہ کر دیا۔ اُن میں بھگدڑ مچ گئی اور ہاتھی کوراک کو لے کر غائب ہو گیا۔

گاؤں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ مرد، عورتیں، بچّے سب اپنی جان بچانے کے لیے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ گھوڑے رسّیاں تڑانے کے لیے اُچھل رہے تھے۔ آخر بارہ چودہ گھوڑے کھونٹوں سے کھُل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ماریسن چلّایا۔ "دو گھوڑے پکڑ لینے چاہییں۔"

یہ سُن کر مریم اُسے ساتھ لے کر گاؤں کے اُس سِرے پر پہنچی جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور بولی۔ "اِن میں سے دو گھوڑے کھول لو۔ میں کاٹھیاں اور لگامیں لے کر آتی ہوں۔"

ماریسن نے پھرُتی سے دو گھوڑے کھولے۔ اِتنے میں مریم کاٹھیاں اور لگامیں لیے ہوئے آ گئی۔ جلدی جلدی کاٹھیاں گھوڑوں پر کسی گئیں اور دونوں اُن پر بیٹھ کر صحیح سلامت نکل گئے۔

# موت کے مُنہ میں

کوراک کو ٹنیٹر جنگل کے اندر بڑی دُور لے پہنچا۔ یہاں اُس نے کوراک کو آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ کوراک نے اپنے آپ کو اُن رسّیوں سے آزاد کرنے کے لیے بڑا زور لگایا جن سے اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے مگر اِتنا طاقتور ہونے پر بھی انہیں نہ کھول سکا۔ اِسی میں صُبح ہو گئی۔ کوراک سمجھ گیا کہ وہ اِسی طرح بندھا بندھا بھوک پیاس سے مر جائے گا۔ کیونکہ ٹنیٹر نہ تو رسّیاں کاٹ سکتا تھا۔ نہ اُن کے بندھن کھول سکتا تھا۔

ماریسن اور مریم دریا کے کنارے کنارے شمال کی جانب مارامار بھاگے چلے جارہے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹنیٹر نے کوراک کی جان بچالی ہے۔ مریم نے ماریسن کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ ٹنیٹر سے کوراک کو کوئی خطرہ نہیں ہے مگر یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی کہ شاید کوراک اپنے بندھن نہ کھول سکے۔

ماریسن بہت بُری طرح زخمی تھا۔ مریم اُسے جلدی سے اپنے منہ بولے باپ یعنی بڑا صاحب کے گھر پہنچانا چاہتی تھی تا کہ اُس کا علاج ہو سکے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ اُسے وہاں چھوڑ کر، بڑے صاحب کو ساتھ لے کر، کوراک کو ڈھونڈنے جائے گی۔

ماریسن اور مریم رات بھر چلتے رہے۔ اگلے روز دِن چڑھنے کے تھوڑے ہی دیر بعد انہیں ایک پارٹی ملی جو جنوب کی طرف جارہی تھی۔ یہ بڑا صاحب اور اس کے حبشی ملازم تھے۔ ماریسن کو دیکھ کر بڑے صاحب کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ مگر وہ مریم کا بیان سُننے کے لیے رُک گیا۔ جب وہ سارا حال

بیان کر چکی تو بڑے صاحب کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ ماریسن کو بھول چکا ہے۔ اُس نے مریم سے کہا۔ ”تم کہتی ہو کہ تم کو کوراک ملا تھا۔ کیا تم نے اسے واقعی دیکھا ہے؟“

”ہاں۔“ مریم بولی۔

بڑے صاحب نے ماریسن کی طرف مُڑ کر اُس سے پوچھا۔ ”تم نے بھی اسے دیکھا ہے؟“

”ہاں صاحب۔“ ماریسن نے کہا۔

”اس کا حُلیہ کیا ہے؟“

”انگریز معلوم ہوتا ہے۔ جسم بہت مضبوط ہے۔ رنگ سانولا ہے۔“

”آنکھوں اور بالوں کا رنگ کیسا ہے؟“

مریم نے جواب دیا۔ ”کوراک کے بال کالے ہیں اور آنکھیں بھوری ہیں۔“

بڑے صاحب نے مُڑ کر اپنی پارٹی کے ایک آدمی سے کہا۔ "مس مریم اور مسٹر ماریسن کو گھر لے جاؤ۔ میں اکیلا جنگل میں جا رہا ہوں۔"

"مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔" مریم نے کہا۔

بڑا صاحب بولا۔ "تمہاری جگہ اس مرد کے پاس ہے جس سے تمہاری شادی ہونے والی ہے۔"

پھر اس نے اپنے آدمیوں کو اشارے سے کہا کہ اس کا گھوڑا لے کر گھر کی طرف روانہ ہو جائیں۔ مریم اپنے گھوڑے پر بے دلی سے سوار ہو گئی۔ ماریسن کو ایک پالکی میں لٹایا گیا اور یہ قافلہ دریا کے کنارے کنارے بڑے صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

بڑا صاحب اسی جگہ کھڑا اُن کو اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ مڑا، اُچھل کر ایک درخت کی ایک شاخ پکڑی اور اس پر چڑھ گیا۔ اُس کی حرکتوں میں بلّی جیسی پھرتی اور چستی تھی۔ درخت کی پھُننگ پر پہنچ کر اُس نے اپنے

کپڑے اتار ڈالے اور شکاری تھیلے سے ہرن کی کھال کی ایک لمبی سی پٹّی نکال کر اُس کی لنگوٹی باندھ لی۔ پھر ایک رسّی نکال کر کندھے پر ڈالی اور چاقو پیٹی میں اُڑس کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی، سینہ تن گیا۔ ہونٹوں پر ڈراؤنی مُسکراہٹ پھیل گئی اور بھوری آنکھیں سکڑنے لگیں۔ اُس نے دبک کر ایک نچلی شاخ پر چھلانگ ماری اور درختوں درختوں جنوب مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ تیز چال سے چلا جا رہا تھا مگر کبھی کبھی رُک کر گوریلے جیسی آواز بھی نکالتا اور اُس کا جواب سُننے کے لیے رُکا رہتا۔ پھر آگے بڑھ جاتا۔

کئی گھنٹے تک چلنے کے بعد ایک جگہ اُس کی پُکار کے جواب میں ایک گوریلے کی ہلکی سی آواز سُنائی دی۔ اُس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اُس نے پھر آواز ماری اور آگے بڑھ گیا۔

جب کوراک کو یقین ہو گیا کہ اگر وہ یہاں اسی حالت میں پڑا رہا تو مر جائے گا تو اس نے ٹنیٹر سے ہاتھیوں کی زبان میں کہا کہ مُجھے شمال کی طرف لے

چل۔ وہاں اُس نے سفید اور کالے دونوں طرح کے آدمی دیکھے تھے۔ اُس نے سوچا، اگر اُن میں سے کوئی نظر پڑ گیا تو اُس سے یہ بندھن کھلوالوں گا۔

راستے میں کوراک کبھی کبھی اس اُمّید پر گوریلوں جیسی آواز لگاتا گیا کہ شاید آ کُوٹ کے کانوں تک پہنچ جائے۔

ادھر آ کُوٹ نے بھی اُس کی آواز سُن لی۔ وہ کوراک سے جنوب کی سمت میں تھا۔ اُس کی آواز پر وہ فوراً اُس کی طرف چل پڑا۔ مگر یہ آواز آ کُوٹ کے علاوہ کسی اور کے کانوں میں بھی پڑی۔ مریم تھوڑی ہی دُور گئی تھی کہ اچانک رُک گئی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”میں صاحب کے پاس جا رہی ہوں۔“

حبشیوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جی نہیں۔ صاحب نے حکم دیا ہے کہ ہم آپ کو گھر لے جائیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ جانا ہو گا۔“

مریم بولی۔ ”تم مجھے نہیں جانے دو گے؟“

حبشیوں نے سر ہلا کر بتایا کہ ایسا ہی کریں گے اور اس کے بعد وہ مریم کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تا کہ اس پر نظر رکھ سکیں۔ مریم اُن کی اس ہوشیاری پر مُسکرائی۔

تھوڑی دُور آگے جانے کے بعد مریم کا گھوڑا ایک درخت کے تلے سے گزرا جس کی ایک شاخ نیچے جھُکی پڑی تھی۔ اگلے لمحے حبشی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مریم کی کاٹھی خالی ہے۔

اُدھر مریم درختوں درختوں تیزی سے چل کر ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں جنگل کے دُھر اندر ہاتھی اکثر آن جمع ہوتے تھے۔ وہ پھُرتی سے مگر آواز کیے بغیر بڑھ رہی تھی۔ اُس وقت اسے صرف یہ دُھن تھی کہ کوراک تک پہنچنا ہے تا کہ اُسے اپنے ساتھ واپس لا سکے۔

اُسے سفر کرتے کئی گھنٹے ہو چکے تھے کہ ایک جگہ گوریلے کی جانی پہچانی پُکار سُنی۔ اس نے جواب میں آواز نہیں نکالی، صرف رفتار اور تیز کر دی۔ یہاں تک کہ ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے اُڑی چلی جا رہی ہے۔

اب اسے ٹنیٹر کے پاؤں کے نشان بھی نظر آرہے تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ صحیح راستے پر چل رہی ہے۔ پھر اچانک اُسے ٹنیٹر دکھائی دینے لگا۔ وہ کوراک کو اپنی بَل کھائی ہوئی سونڈ میں تھامے ہوئے جھومتا جھامتا جارہا تھا۔

مریم چِلّائی۔ "کوراک۔" ہاتھی فوراً مُڑا۔ اُس نے کوراک کو زمین پر رکھ دیا اور چنگھاڑتے ہوئے کوراک کو بچانے کے لیے لڑنے مرنے کو تیّار ہو گیا۔

کوراک نے مریم کی آواز پہچان کر رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "مریم۔"

مریم خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے درخت سے اُتر پڑی اور کوراک کے بندھن کھولنے کے ارادے سے اُس کی طرف لپکی۔ لیکن ٹنیٹر نے ٹکّر مارنے کے لیے مستک جھکالی اور اِس طرح چنگھاڑا جیسے کہتا ہے کہ پرے رہ، ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔

"واپس چلی جاؤ۔" کوراک چلّایا۔ "ورنہ یہ تُم کو مار دے گا۔"

مریم نے ہاتھی سے کہا۔ "ٹنیٹر! کیا تُو مُجھے بھول گیا؟ میں مریم ہوں۔ میں

تیری پیٹھ پر سواری کیا کرتی تھی۔"

مگر ٹنیٹر چنگھاڑتا اور غصّے سے سونڈ ہلاتا رہا۔ کوراک نے ٹنیٹر کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اُس نے وہ بھی نہ مانا۔ اب اُسے ہر انسان اپنا دُشمن نظر آنے لگا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ لڑکی اُس کے دوست کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ اُس لیے قریب نہیں آنے دے رہا تھا۔

کوراک نے ایک تدبیر سوچی۔ اُس نے مریم سے کہا۔ "تُم ایسا ظاہر کرو جیسے یہاں سے جا رہی ہو۔ اُس رُخ پر رہو جدھر سے ہوا ہماری طرف نہیں آرہی ہے تاکہ ٹنیٹر کو تمہاری بُو نہ آئے۔ پیچھے پیچھے چلتی رہو۔ میں کچھ دیر بعد اُس سے کہوں گا کہ مجھے زمین پر رکھ دے اور اُسے کسی بہانے سے ٹال دوں گا۔ تُم چُپکے سے آ کر میرے بندھن کاٹ دینا۔"

مریم نے کہا۔ "میرے پاس چاقو ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔ شاید ٹنیٹر ہماری چال میں آجائے۔"

وہ پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی۔ ہاتھی اُس کی آہٹ لینے اور سونڈ اُٹھا کر اُس

کی بُو سُونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوراک نے ہاتھی کی توجّہ مریم کی طرف سے ہٹانے کے لیے اُسے حکم دیا کہ وہ اُسے اُٹھا لے اور پھر چلنا شروع کر دے۔ ٹنیٹر نے حکم مان لیا اور شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اچانک کوراک کے کانوں میں گوریلے کی آواز پڑی جو بہت دُور سے آ رہی تھی۔

اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”آ کُوٹ کی آواز ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ آ کُوٹ آ رہا ہے۔ ٹنیٹر آ کُوٹ کو جانتا ہے۔ اُسے میرے قریب آ جانے دے گا۔“ اُس نے آ کُوٹ کی پُکار کے جواب میں اُونچی آواز سے صدا لگائی۔

ایک جگہ پہنچ کر کوراک کے نتھنوں میں پانی کی بُو آئی۔ اُس نے ٹنیٹر کو حکم دیا کہ اُسے زمین پر رکھ دے اور اپنی سونڈ میں پانی بھر کر لے آئے۔ وہ جگہ کھُلی ہوئی تھی اور بیچوں بیچ گھاس بھی اُگ رہی تھی۔ ٹنیٹر نے کوراک کو گھاس پر رکھ دیا اور کھڑا ہو کر خطرے کی آہٹ لینے لگا۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ اُس کے دوست کو کوئی خطرہ نہیں ہے تو اُس ندی کی طرف چل دیا جو وہاں سے دو تین سو گز دُور تھی۔

مگر وہ بڑا شکّی حیوان تھا۔ جنگل میں گھُسنے کے بعد مُڑ کر اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور یہ دیکھنے لگا کہ وہ لڑکی کوراک پر دوبارہ حملہ کرنے تو نہیں آتی جو ایک دفعہ آچکی ہے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ندی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اُس کی طرف سے اطمینان کر لے گا۔

اس نے دیکھا کہ اس کا شک بے جا نہیں تھا۔ وہ لڑکی ایک درخت سے کُود کر کوراک کی طرف جھپٹ رہی تھی۔ ٹنیٹر رُکا رہا کہ لڑکی کوراک تک پہنچ جائے پھر اُس پر حملہ کرے گا تاکہ بچ کر نہ جا سکے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔

اِدھر مریم نے کوراک کے پاس پہنچ کر چاقو نکالا اُدھر ٹنیٹر جنگل سے نکل کر چنگھاڑتا ہوا اس پر ٹوٹ پڑا۔ کوراک نے چیخ کر اُسے روکا مگر وہ نہ رُکا۔ مریم پوری طاقت سے درختوں کی طرف بھاگنے لگی مگر ٹنیٹر نے اُسے جا لیا۔ کوراک کی آنکھیں خوف سے باہر نکلنے لگیں۔ مریم اور ہاتھی میں چند قدم کا فاصلہ تھا۔

# بڑا صاحب

اچانک ایک درخت پر سے ایک ننگا سفید دیو کُودا اور ہاتھی کا رستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کوراک کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اِس طرح گھور گھور کر دیکھنے لگا جیسے بھُوت نظر آ گیا ہے۔

اس اجنبی نے کڑک دار آواز میں ٹنیٹر کو حکم دیا وہ جہاں تھا وہیں رُک کر کھڑا ہو گیا۔ کمال یہ تھا کہ اجنبی بالکل خالی ہاتھ تھا، مگر ٹنیٹر نے اُس کا حکم مانا۔ اتنے میں مریم درخت پر چڑھ گئی۔

کوراک کی نظریں مریم کی جان بچانے والے اجنبی پر جمی ہوئی تھیں۔ جب اُس نے پہچانا کہ وہ کون ہے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیا یہ وہی ہے؟ نہیں۔ وہ نہیں ہو سکتا۔

مریم بھی حیران کھڑی اجنبی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک اجنبی نے اُس سے کہا۔ "آؤ مریم۔" اب مریم نے پہچانا کہ وہ کون ہے۔ اُس کے مُنہ سے نکلا۔ "ابّا" پھر وہ اُسی دم درخت سے کودی اور دوڑ کر اُس کے پاس پہنچ گئی۔ اجنبی اُسے ساتھ لیے ہوئے اُس جگہ پہنچا جہاں کوراک پڑا تھا اور بے اختیار ہو کر کہا۔ "جیک۔"

"ابّا۔" کوراک رُندھے ہوئے گلے سے چلّا اٹھا۔

وہ اجنبی مریم کا منہ بولا باپ جسے جنگلی بڑا صاحب کہتے تھے، ٹارزن تھا۔ اُس نے جلدی جلدی کوراک کے بندھن کاٹے، پھر مُڑ کر مریم سے بولا۔ "میں نے تُم کو کہا تھا کہ گھر جاؤ۔" مریم نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ نے یہ کہا تھا کہ میری جگہ اُس مرد کے پاس ہے جس سے میری

شادی ہونے والی ہے۔" یہ کہہ کر کوراک کی طرف دیکھنے لگی۔

اچانک ٹنیٹر چنگھاڑا۔ وہ اُن درختوں کی طرف گھور رہا تھا، جو ان کے پیچھے تھے۔ انہوں نے اُدھر دیکھا تو ایک گوریلے کا سر اور کندھے نظر آئے۔ یہ آکُوٹ تھا، جو انہیں دیکھتے ہی خوشی سے چیخ مار کر زمین پر کُود پڑا اور چلّاتا ہوا اُن کی طرف بڑھا۔ ٹارزن واپس آ گیا۔ جنگل کا بادشاہ آ گیا۔ وہ اُچھل اُچھل کر اُن کے گرد چکّر کاٹنے لگا۔

کوراک نے اپنا ہاتھ بڑی محبّت سے باپ کے کندھے پر رکھا اور کہا۔ "ٹارزن ایک ہی ہے۔ اُس جیسا اور کوئی کبھی نہ ہو گا۔"

دو دِن بعد ٹارزن، کوراک اور مریم ایک میدان کے سِرے پر، جہاں سے بنگلہ دکھائی دے رہا تھا، درختوں سے زمین پر اُترے۔ ٹارزن نے اپنے کپڑے اُس درخت پر سے نکال کر پہن لیے جس میں چھُپا گیا تھا۔ کوراک کے پاس کپڑے نہیں تھے، اِس لیے ننگا ہی رہا، مگر وہ اِس حالت میں ماں کے سامنے جانے کو تیّار نہ ہوا اور مریم اُس کے بغیر جانے پر راضی نہ تھی۔

ٹارزن اکیلا ہی بنگلے کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کی بیوی جین دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس نے مریم کو نہ دیکھا تو رونے لگی مگر جب ٹارزن نے بتایا کہ مریم بھی زندہ ہے اور اُن کا بیٹا بھی مِل گیا ہے تو اتنی خوش ہوئی کہ بچّوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔

جب اس نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ وہ دونوں کہاں ہیں تو ٹارزن نے اسے بتایا کہ "اُس کا بیٹا چیتے کی کھال کی لنگوٹی باندھے ہوئے ہے۔ وہ ننگا دھڑ نگا اُس کے سامنے نہیں آنا چاہتا اور مریم کہتی ہے کہ وہ بھی اُسی کے ساتھ آئے گی۔ اب میں اُس کے لیے لباس لینے آیا ہوں۔" جین خوشی کے مارے اتنی بدحواس ہو گئی تھی کہ جیک کے بچپن کے کپڑے نکال کر دینے لگی۔ اُس پر اُس کے شوہر کو ہنسی آ گئی۔ اُس نے کہا۔ "اب یہ کپڑے اُس کے نہیں آئیں گے۔ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ میرے کپڑے دو۔"

ایک گھنٹے بعد کوراک گھر آ کر ماں سے ملا۔ وہ بے حد خوش ہوئی۔ پھر مریم سے کہنے لگی۔ "میری عزیز بچّی، تم کو یہ سُن کر رنج ہو گا کہ ماریسن زخموں

کی تاب نہ لا کر چل بسا۔"

مریم بولی۔ "مجھے افسوس ہے۔ مگر میں اُس سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

جین نے لپک کر کوراک اور مریم دونوں کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔ "مجھے اپنا بیٹا ہی نہیں ملا، بیٹی بھی مل گئی۔"

کوراک اور مریم کی شادی وہیں کر دی گئی۔ پھر ٹارزن اپنے خاندان سمیت انگلستان واپس آ گیا۔

اسے یہاں پہنچے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اُس کے پرانے دوست ڈارنوٹ نے ایک شخص جنرل جیکوٹ کو ایک خط دے کر اُس کے پاس بھیجا۔ یہ شخص فرانس کے شاہی خاندان سے تھا۔ اُس نے بتایا کہ برسوں پہلے افریقہ میں اُس کی بیٹی گُم ہو گئی تھی جس کا پھِر کُچھ پتہ نہ چلا۔ مگر اب ایک ہفتہ پہلے ایک افریقی جس کا نام کامک تھا، آ کر اُس سے ملا اور کہا کہ وہ اُسے اس کی بیٹی تک پہنچا سکتا ہے۔

ٹارزن نے اس سے پوچھا۔ ”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ لڑکی آپ کی بیٹی ہے؟“

جنرل نے جواب دیا۔ ”اُس افریقی نے اُس کی بیٹی کے بچپن کا ایک فوٹو دکھایا ہے جس کے پیچھے انعام کا اشتہار ہے۔ اب میں کامک کے ساتھ افریقہ جانا چاہتا ہوں اور اِس سلسلے میں آپ سے صلاح لینے آیا ہوں۔“ ٹارزن نے فوٹو دیکھا تو فوراً اپنی بہو کو بُلوا لیا۔ جنرل نے بیٹی کو پہچان لیا۔ جیک اور اُس کی ماں کو بھی بُلا لیا گیا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے اور اس طرح یہ قصّہ ختم ہوا۔

(ختم شُد)